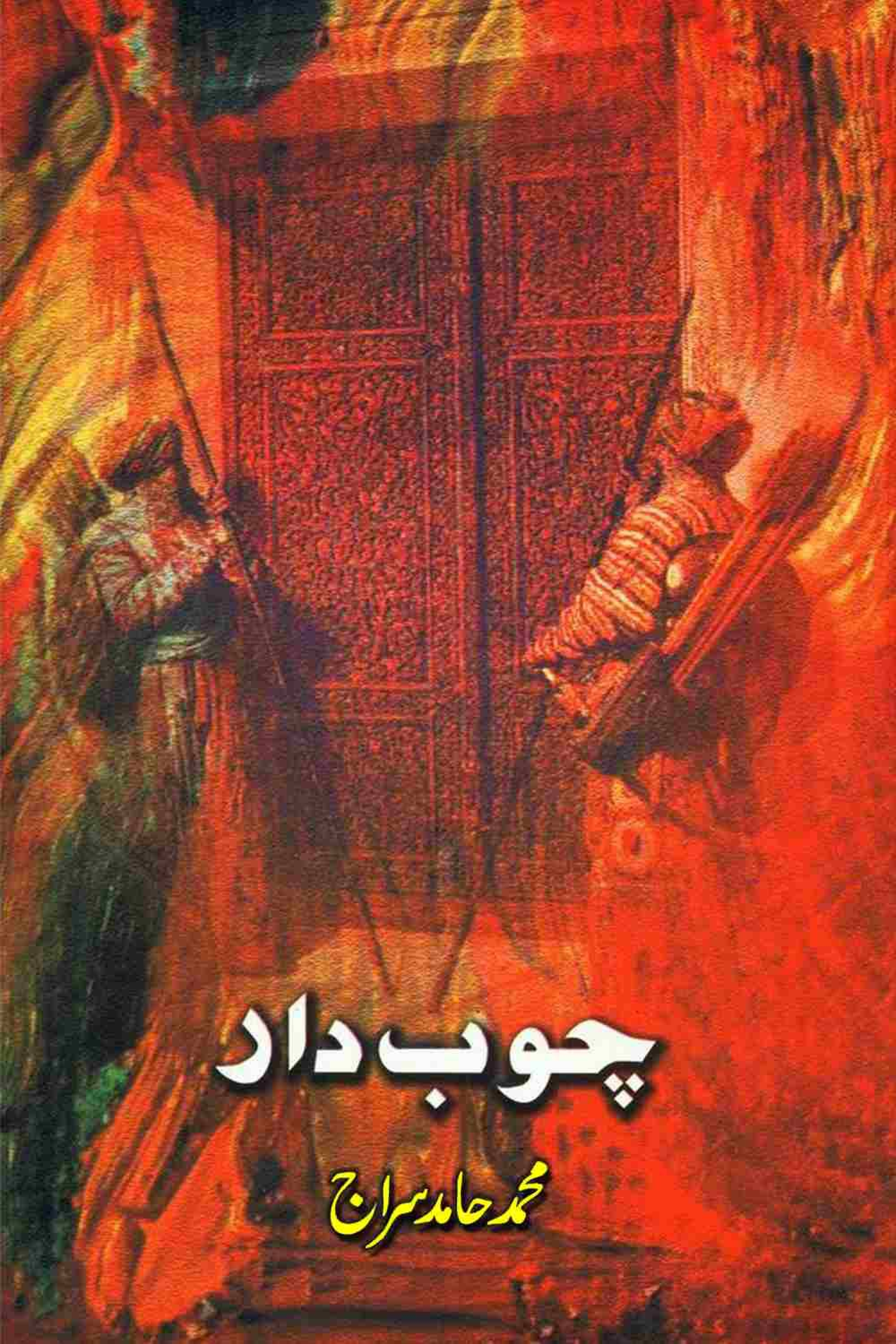

چوب دار
محمد حامد سراج

چوب دار

محمد حامد سراج

پورب اکادمی، اسلام آباد

©: 2009ء پُورب اکادمی

طبع دوم: جون2009ء

ناشر: پُورب اکادمی، اسلام آباد

فون نمبر: 051 - 5819410, 0301 - 55958 61

ای میل: poorab_academy@yahoo.com

ویب سائٹ: www.poorab.com.pk

پتہ مصنف: ڈاکخانہ چشمہ بیراج، ضلع میانوالی (پوسٹ کوڈ42030)

فون نمبر: 0459-805125, 0333-6833852

ای میل: hamidsiraj@hotmail.com

hamid42221@yahoo.com

ISBN:978-969-8917-73-9

میں ادب میں دائیں اور بائیں بازو کی بجائے صرف اور
صرف راست سمت کا قائل ہوں۔

(محمد حامد سراج)

انتسابِ ثانی

معتبر نقاد، ادیب، دانش ور، افسانہ نگار

محمد حمید شاہد

اور

کتاب شناس، کتاب دوست

سائرہ غلام نبی

کے نام

انتسابِ اوّل

ہم سفر، ہم دم، غم گسار، چارہ ساز

شگفتہ حامد سراج

اور

عمرِ رواں کی بے اعتبار سانسوں کے تسلسل

امامہ، حفصہ

اسامہ احمد، قدامہ احمد

کے نام

ترتیب

اجتماعی مات	۹
خودداری کی نیند	۲۰
قدیمی کرسی اور کتاب کی مرمّت	۲۶
اُلٹے پاؤں	۳۳
لرزیدہ لمحوں کا تاوان	۴۳
شور بہت کرتا تھا	۵۵
میکینک کہاں گیا	۶۱
لالٹین جلتی رہے	۷۵
بوسیدہ آدمی کی محبت	۸۳
امام غزالی کا گم شدہ کردار	۹۱
ڈرائنگ رُوم اِک گزرگاہ ہے	۱۰۰
ذہن بازار	۱۱۷

گرمی بہت ہے	۱۲۴
بے انت صحرا	۱۲۷
اعلان	۱۳۶
کنجی	۱۴۴
چوب دار	۱۵۰
کنواں، کٹورا اور کوا	۱۶۴
کاغذ کی راکھ	۱۶۹

اجتماعی مات

اس نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ اگر میری یادداشت کی چُولیں ڈھیلی نہیں پڑیں تو اوورکوٹ کا رنگ سبز تھا۔ یہ عرض کرتا چلوں کہ اس اوورکوٹ کا سلسلہ کہیں بھی غلام عباس کے مشہور افسانے ''اوورکوٹ'' سے نہیں جڑتا۔ دیکھنا یہ ہے سبز اوورکوٹ پہنے وہ جا کہاں رہا ہے۔۔۔؟ اس کی سمت کیا ہے۔۔۔؟ اکثر شام ڈھلے وہ ہوسٹل کے کمرے سے بے ترتیب بالوں سمیت نکلتا، کمرے کا دروازہ بھیڑتے ہوئے سیٹی کی آواز کوریڈور میں گونجتی۔ سیڑھیاں اتر کر وہ برآمدے میں کھڑا ہو کر ایک بھرپور انگڑائی لیتا۔ منہ پر الٹا ہاتھ جمائی کے انداز میں جما کر عجیب وغریب آوازیں نکالتا پھر بازو ڈھیلے چھوڑ کر ہر طرف نگاہ دوڑاتا۔ آہستہ آہستہ برآمدے سے باہر نکلتا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا برآمدے کی مغربی سمت کی سیڑھیاں اُترتا کالج گراؤنڈ کا رخ کرتا۔ کالج گراؤنڈ کے اطراف سٹنگ ارینجمنٹ کسی بڑے عالمی کھیل کے میدان کا نقشہ پیش کرتی تھیں۔ وسیع وعریض گراؤنڈ میں اس کی نشست مخصوص تھی۔ سرد شاموں میں وہ وہاں تنہا بیٹھا کسی انگریزی فلم کا کردار لگتا۔ سگریٹ وہ کوٹ کی دائیں جیب میں اور ماچس بائیں جیب میں رکھنے کا عادی تھا۔ جب وہ

گراؤنڈ میں داخل ہوا دسمبر کی سرد ہوا ہڈیوں کو چیرتی پورب سے پچھم کو چلتی تھی۔اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا۔بائیں جیب میں ماچس نکالنے کو ہاتھ ڈالا تو ماچس کی بجائے لائٹر اس کے ہاتھ میں تھا۔یہ اسے صبح ایک دوست نے تحفہ دیا تھا۔اس نے لائٹر کے سرخ اور نیلے شعلے کو غور سے دیکھا۔وہ بہت دیر لائٹر کو ہاتھ میں تھامے غور سے دیکھتا رہا۔ٹرانس پیرنٹ لائٹر میں لیکوئڈ گیس کو اس نے ایسے دیکھا جیسے یہ کوئی نئی دریافت ہو۔اچانک جانے اسے کیا سوجھی وہ کھڑا ہوا۔جسم کو تولا، بازو کو گھما کر لائٹر پھینکا وہ گراؤنڈ کے وسط میں کہیں جا گرا۔

''یار یہ کیا مذاق ہے۔۔۔؟''

اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا ایک لمبا تڑنگا بڑھی شیو اور اُلجھے بالوں والا ہوسٹل فیلو کھڑا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔؟''

''کیا گراؤنڈ کی تم نے بکنگ کرا رکھی ہے۔۔۔؟''

''بیٹھو۔۔۔''

''یہ لائٹر کو کس خوشی میں گھما پھینکا ہے۔۔۔؟''

''دفعہ کرو یار! لائٹر سے تو دانتوں میں خلال بھی نہیں ہو سکتا۔ماچس کا اپنا ایک مزہ ہے تمبا کو کے ساتھ تیلی کے سرے پر لگے بارود کی بُو۔۔۔اس کا اپنا ایک مزہ ہے۔''

اس نے کوٹ کی بائیں جیب سے ماچس نکالی، سگریٹ سلگایا، منہ میں سے دُھوئیں کے گول گول چھلے نکالے، اپنی ادا پر خود ہی مسکرایا۔دُھوئیں سے چھلے بنانے کا فن اس نے چند روز قبل سیکھا تھا۔کالج کا اپنی نوعیت میں وہ منفرد کردار تھا۔گفتگو کے دوران متنوع موضوعات پر طبع آزمائی اس کے مزاج کا حصہ تھا۔بیڈمنٹن اور ڈرافٹ کا وہ مشّاق کھلاڑی تھا۔ڈرافٹ کا وہ بے تاج

بادشاہ کہلاتا تھا۔اس کھیل میں اپنے آپ کو یکتا سمجھنے والے اس کے سامنے بے بس ہو جاتے تھے۔جیت جانے کا نشہ اس کے چہرے پر اُبھرتا ضرور تھا لیکن اس کی کوئی ادا اوچھی نہیں تھی۔

وہ سگریٹ سے چھلے بناتے ہوئے جانے کن خیالوں میں گم تھا۔۔۔؟ یہ لم تڑنگ آج گراؤنڈ میں کیا لینے آیا ہے۔۔۔؟ یہ دفعہ کیوں نہیں ہوتا۔اس بے وقوف کو کیا معلوم کہ تنہائی کی محفل کا لطف کیا ہوتا ہے۔یادوں کے میلے میں گھومنے کا اپنا الگ لطف ہے۔یہ ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔

''یار وہ لائٹر میں اُٹھالوں۔۔۔؟''

''ہاں اُٹھالے یار۔۔۔''اس نے بےزاری سے کہا۔

لائٹر اُٹھا کر وہ دوبارہ اس کے پاس آبیٹھا۔

''آج کی تازہ خبر سنی ہے۔۔۔؟''

''کیا۔۔۔؟''

''عجیب سی خبر ہے۔۔۔ہے بھی تمہارے بارے میں۔۔۔!''

''میرے بارے میں۔''

''ہاں۔۔۔تمہیں بڑا زُعم ہے نا۔۔۔ڈرافٹ میں تمہیں کوئی مات نہیں دے سکتا۔کل سہ پہر ڈھلنے پر تم ڈرافٹ ہار جاؤ گے۔۔۔اور ممکن ہے اس شکست کے بعد تم ڈرافٹ کھیلنا ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو۔۔۔''

''میں سمجھا نہیں۔۔۔کس نے چیلنج کیا ہے مجھے۔۔۔؟''

''ادریس علی۔۔۔''

''ادرررریس علی۔۔۔اسے تو کبھی ڈرافٹ کھیلتے دیکھا ہی نہیں گیا۔''

"کل سارا ہوسٹل دیکھ لے گا۔"

سرد ہوا پورب سے پچھم کو چلتی تھی۔ وہ گراؤنڈ سے واپس ہوئے تو شام کی لالی رات کی سیاہی میں مدغم ہو چلی تھی۔ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا رات کے کھانے کے لیے میس میں داخل ہوا۔ کھانا کھانے کے دوران اس کے ذہن میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔۔۔ مجھ سے پوچھے بنا یہ ڈھنڈورا کس نے پیٹا۔۔۔؟ خیر چٹکی کی مار ہے لیکن اگر میں ہار گیا تو۔۔۔؟ نہیں نہیں۔۔۔ مجھے نہیں ہارنا ہے۔۔۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں آیا۔ الماری سے ڈرافٹ نکالی اور پھر رات گئے تک بیٹھا چالوں پر غور کرتا رہا۔ اس کے اندر جنگ جاری تھی۔ اس نے ادریس علی خان کو کبھی ڈرافٹ کھیلتے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ پھر بھی خائف ہو گیا۔ اس کی نیند اڑ گئی۔ سہ پہر میں اتنی دیر کیوں ہے۔۔؟ سہ پہر کا لمحہ کب آئے گا۔۔ فیصلہ تمام ہو۔۔ یہ ذہن بھی عجیب کارخانہ ہے اس میں کوئی ایک بات اپنی تکمیل کے مراحل سے گزر رہی ہو تو جب تک وہ تیار ہو کر مکمل نہ ہو، یہ کارخانہ کچھ اور قبول ہی نہیں کرتا۔۔۔ سارے کام دھرے رہ جاتے ہیں۔ بس کھٹ کھٹ سنائی دیتی رہتی ہے۔

ادریس علی خان ایک دھیمے مزاج کا نوجوان تھا۔ نکلتا ہوا قد، شانوں پر بال بکھرے ہوئے، مانگ درمیان سے نکلی ہوئی، داڑھی ترشی ہوئی، بائیں کان میں بُندا، داہنے ہاتھ کی وسطی انگلی میں چاندی کی انگوٹھی جس میں یاقوت جڑا ہوا، خاموش طبع، چال میں وقار اور متانت۔۔۔ بارش کے موسم میں دوستوں کے اصرار پر اپنی سریلی لے میں دوہڑے الاپتا تو پرندے ہوا میں پرواز روک لیتے، بانسری اور اکتارہ بجانے میں بھی وہ یکتا تھا۔ اس کی گیلی آنکھوں میں جانے کون بسا تھا۔۔۔؟ لڑکے کہتے تھے اسے عشق نے باندھ رکھا ہے اس کی شخصیت کا سحر عشق کی دین ہے۔

عصر کے بعد لڑکے ہوسٹل کے لان میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ادریس علی سیمنٹ کے بنچ پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔

وہ ڈرافٹ بغل میں دبائے لان میں آیا تو خوب تالیاں بجیں۔اس نے ادریس علی سے ہاتھ ملایا۔ڈرافٹ سیمنٹ کے بنچ پر سجائی۔کالی اور سفید گوٹیاں ترتیب سے رکھیں۔

''گیم ہارنا پسند کرو گے یا بلاک کر دوں۔۔۔؟''

اس نے سر اُٹھا کر ادریس علی کو تکّن دیکھا۔۔۔''میں اس زعم کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟''

''زعم نہیں ہے مجھے۔۔جیت سے میرے من میں کوئی خوشی نہیں پھوٹتی۔مدِ مقابل کی ہار کا درد بھی مجھے تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔لیکن کیا کروں۔۔شاید کسی کی دعا ہے۔میں آج تک اپنی ذات کا یہ عقدہ نہیں حل کر پایا کہ میں کیوں جیت جاتا ہوں۔''

''گفتگو بند۔۔گفتگو بند بھئی۔۔۔اب کھیل شروع ہو۔۔۔پانچ بازیاں ہوں گی۔''

''بازی تو ایک بھی کافی ہوتی ہے۔۔۔'' گیلی آنکھوں والے نے چاندی کی انگوٹھی گھمائی۔

کھیل شروع ہوا۔پانچ سات چالوں میں ہی ادریس علی نے سارے رستے مسدود کر دیے۔اس کے پاس چال چلنے کو کوئی رستہ نہیں تھا۔وہ ہر طرف سے گھر چکا تھا۔گیم بلاک ہو گیا اور وہ پہلی بازی ہار گیا۔

دوسری بازی۔۔۔اس نے چالوں کو تازہ کیا۔۔۔سارے داؤ آزما ڈالے لیکن ہار اس کا مقدر تھی۔۔۔ادریس علی نے انگلی میں انگوٹھی گھمائی۔سفید گوٹی سے پہلی چال بڑھائی اور کہا۔۔۔

''دوست ایک بات ذہن میں رکھنا۔۔۔یہ کھیل ہے۔۔کھیل میں جذباتی نہیں ہوا کرتے۔ہر کھیل ٹھنڈے دماغ سے۔۔۔جیت گئے تو جیت گئے۔۔مات کو بھی تو جیت مانا جا سکتا ہے۔تم نے کھیل کی ہار جیت کو سنجیدگی سے نہیں لینا۔''

اسے اندازہ ہو گیا کیوں کہ وہ خود ایک مشاق کھلاڑی تھا کہ اس کا مدِمقابل اس کھیل میں اس سے کہیں زیادہ ماہر ہے تیسری بازی طول کھینچ گئی لیکن وہ ہار گیا۔۔۔! تالیوں کے شور کے باوجود اس نے اپنا حوصلہ برقرار رکھا اس کی وجہ شاید ادریس علی خان کا متبسم چہرہ تھا۔ یکے بعد دیگرے تین بازیاں ہارنے کے بعد وہ میچ ہار چکا تھا۔ آخری دو بازیاں کھیلنا عبث تھا۔ وہ سیمنٹ کے بنچ سے اٹھا۔ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے سگریٹ سلگایا۔ لان میں بیٹھے لڑکوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ چار کی ٹولی لُڈو کھیل رہی تھی۔ دو لڑکے ہمیشہ کی طرح ''نوگیٹی'' کھیلنے میں مگن تھے۔ ایک لڑکا جو، ڈمپر موٹو کے نام سے معروف تھا کوئی کھیل کھیلنا اس کا مشغلہ نہیں تھا اس کے پاس ایک اچھی نسل کا پاکٹ ریڈیو تھا۔ وہ اس پر دنیا جہان کی خبریں سنتا، موسیقی، کلاسیکی راگ، تجزیے اور زراعت کے پروگرام تک سننا اس کا معمول تھا۔ مائل بہ فربہی ڈمپر موٹو کالج کے اوقات کے بعد ہمیشہ نیکر پہنتا، جین کی شرٹ جس کے کالر پر میل جم چکی تھی۔ بکھرے ہوئے گھنگریالے بال، پاؤں میں ہوائی چپل، چلنے کا انداز نرالا، جھولتا ہوا کندھے جھکا کر جیسے بلندی سے پستی کو اتر رہا ہو۔۔ لڑکے اس کا مذاق اڑاتے کہ موٹو زوال کی علامت ہے۔

آج اس نے ڈرافٹ میں بری طرح مات کھائی تھی۔ وہ سوچتا رہا ایک عرصہ میں نے اپنا مغز کھپایا لیکن پھر بھی ادریس علی سے ہار گیا۔۔ کیا مجھے اس سے ڈرافٹ دوبارہ سیکھنا چاہیے۔ حرج ہی کیا ہے۔۔۔ معلوم تو ہو وہ کیسے چال بناتا ہے کہ سارے کھیل پر، چھا جاتا ہے۔ وہ کمرے میں لیٹا سوچوں میں غلطاں و پیچاں اپنے آپ سے بے خبر ہار جیت کے فلسفے پر غور کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔۔۔ حسبِ معمول اس نے کہا۔

''اندر آجایئے۔۔۔''

وہ حیرت سے اُچھلا۔۔۔ ادریس علی پہلی بار اس کے کمرے میں آیا تھا۔ اس نے ہیٹر پر

چائے رکھی پلیٹ میں بسکٹ سجائے۔۔ چائے کے ساتھ ہی اس نے الماری سے ڈرافٹ نکالی۔

''ڈرافٹ رہنے دو یار۔۔۔آج باتیں کریں گے۔''

''ادریس علی تم اس کھیل میں طاق کیسے ہوئے۔۔۔؟''

''کوئی خاص بات نہیں۔۔۔بس تجربہ۔۔۔اور داؤ پیچ۔۔۔تم بھی تو اتنے بہت سے لوگوں سے جیت جاتے ہو۔ہار جیت زندگی کا حصہ ہے۔ہار جانے پر حوصلہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔چائے کا خیال کرو۔۔۔ہیٹر بند کرو۔۔۔''

اوہ۔۔اس نے چائے پیالیوں میں اُنڈیلی۔

''ادریس علی۔۔۔یہ پُتلی تماشا نہیں ہے کیا۔ہم سب پُتلیاں ہیں۔ہماری مرضی کیا ہے۔۔۔؟کبھی سوچا تم نے۔۔۔مقدر کیا ہے۔۔۔؟ہم بیمار ہوتے ہیں یہ ہمارے بس میں نہیں ہم بیمار نہ ہوں ہم بوڑھے ہو جاتے ہیں۔عمر کے زوال کو روکنا بھی ہماری دسترس میں نہیں ہے۔۔۔ہم ہار گئے تو قسمت کو کوس لیا جیت گئے تو قسمت کے دھنی کہلائے۔۔۔ہم کیا ہیں۔۔۔زمین پر نائب لیکن خود مختار تو نہیں ہیں نا۔۔۔!''

''چھوڑو یار۔۔چپ چاپ زندگی جیے جاؤ۔ذہن میں دوڑنے والے سوالات کو لگام دیا کرو۔ایسا نہ ہو یہ بے لگام گھوڑے ایک روز تمہاری لاش گھسیٹیں۔مان لینے میں آسانی ہے۔۔۔جینا ہے تو اللہ کو ایک مان لینے میں حرج ہی کیا ہے۔۔۔موت سے ہم کنار تو ہونا ہے۔انسان اسے ایک تسلیم نہ کرے اس سے کائنات میں کوئی فرق نہیں پڑتا اپنی راہ کھوٹی ہوتی ہے۔بڑا گہرا فلسفہ ہے دماغ کی چُولیں ہلا دیتا ہے اسی لیے کہا ہے سوالات کے گھوڑوں کو لگام دیے رکھا کرو یہ بے لگام ہو جائیں تو برباد کر دیتے ہیں۔زندگی روند ڈالتے ہیں۔مفکرین نے عمریں کھپا دیں۔۔بس تسلیم و رضا کا فلسفہ ہی کام آتا ہے۔'' چائے کی چسکیوں کے درمیاں وہ محوِ گفتگو تھے کہ

ڈمپر موٹو ریڈیو کان سے لگائے اندر داخل ہوا۔

''ملکی حالات سخت خراب ہیں۔۔۔میں نے سوچا سب کو اطلاع کر آؤں۔''

''خبرنامے سُن سُن کر تیرا دماغ کام چھوڑ گیا ہے۔میڈیا ہمیشہ حکومت نامہ نشر کرتا ہے۔یہ سیاسی کھیل ہیں۔چینل بدل لیا کر۔۔۔ہر طرف امن ہے۔چین ہے۔۔۔مت خوف پھیلایا کر۔۔۔!''

''نیرو بھی چین کی بانسری بجاتا رہا تھا۔۔۔تم سب بھی مل کر بانسری بجاؤ۔''

ڈمپر موٹو دروازہ بھیڑ کر چلا گیا۔

''یار! ہم نے بے چارے کی بات پر توجہ نہیں دی۔بات تو اس کی ٹھیک تھی۔''

''چھوڑ و یار۔۔۔بے خبری کا اپنا ایک مزہ ہے۔''

''چاہے طوفان سب کچھ بہالے جائے۔''

''کچھ نہیں ہوگا یار۔۔۔!''

''بات ہونے یا نہ ہونے کی نہیں ہے۔۔۔ملکی تو خیر ملکی، عالمی حالات کا بگاڑ جانے زمین پر کیا گل کھلائے۔''

''چھوڑو۔۔۔تم مجھے ڈرافٹ کے گُر سکھاؤ۔''

''تمہاری اسی لا پروا، طبیعت سے مجھے ڈر لگتا ہے تم زندگی کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لیتے۔۔۔؟ ہم افراد سے ہی معاشرہ ترتیب پاتا ہے۔اقوام جنم لیتی ہیں۔سلطنت پھلتی پھولتی ہے۔''

''یار۔۔۔یہ اتنا گاڑھا فلسفہ۔۔۔کالج لائف کے بعد ساری عمر کا روگ ہے۔ابھی تو چار دن عیش کر لیں۔۔۔آتش جواں ہے۔''

''ہاں محمد بن قاسم بھی جوان تھا۔۔۔، سترہ سال اس کی عمر تھی۔۔۔جس عمر میں ہم ڈرافٹ کھیل رہے ہیں اِس عمر میں وہ جنگی چالیں کھیلتا تھا۔اس عمر میں اس نے بابِ سندھ پر آ دستک دی تھی۔''

''ہاہاہاہاہا۔۔۔ہاہاہا۔۔آج کا محمد بن قاسم لُڈو، ڈرافٹ اور نوگیٹی کھیلتا ہے اور اور۔۔۔!''

''ہنسنے کی بات نہیں ہے۔۔۔!ابھی تو وہ کہہ کر گیا ہے کہ ملکی حالات سخت خراب ہیں۔''

وہ موضوعات کو چباتے رہے۔۔۔ بہت دیر بعد وہ پھر کیفے ٹیریا کا ارادہ کر کے کمرے سے نکلے۔دونوں ہوسٹلوں کے درمیان مختصر سے ٹیرس پر لگی لکڑی کی ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے ڈمپر موٹو ریڈیو سُن رہا تھا۔وہ اُس کے پاس سے گزرے۔

''لاشیں ہی لاشیں۔۔۔بارش ہو رہی ہے۔۔۔میزائلوں کی بارش۔۔۔موسلا دھار بارش۔۔۔حالات سخت خراب ہیں۔''

''یہ پاگل ہے۔۔۔''

''نہیں یار۔۔۔کم سے کم خبر تو رکھتا ہے نا۔۔۔''ادریس علی نے کہا۔

''خبر رکھنے سے کیا مصیبت ٹل جائے گی۔درمیان میں سمندر ہے اور نفرت کے سمندر کی گہرائی عمیق ہے۔کھیل کھیلنے والے اپنا کردار ادا کر چکے۔کسی آن خبر آئے گی کہ انھوں نے ہمارا آدھا وجود کاٹ کے پھینک دیا ہے۔ہم کیا کر سکتے ہیں، ابھی کل ہی ہم نے فارٹی سیون میں خون کا سمندر عبور کیا ہے۔''ان کا رُخ کیفے کی جانب تھا۔

''دوست ایک بات پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔''

''تمہارا یہ جوا وور کوٹ ہے۔۔۔سنا ہے کسی امیر کبیر لڑکی نے تمہیں مہنگے داموں خرید کر تحفہ

دیا تھا۔"

ہاں۔۔۔ یہ سچ ہے۔ میں سارا دن بس اسٹاپوں پر لڑکیوں کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ ایک لڑکی تھی یار، غضب کی خوبصورت تھی۔ اس کے ہر عضوِ بدن سے حُسن چھلکتا تھا۔ لیکن سالی لفٹ نہیں کراتی تھی۔۔۔ جانے کیسے ایک دن انہونی ہوگئی۔ وہ مجھ پر مہربان ہوگئی۔ ایک کیفے میں اس نے مجھے چائے پر مدعو کیا۔ میز پر ہم آمنے سامنے تھے اور سارے موسم اس کے بدن سے پھوٹتے تھے۔ میز پر وہ کہنیوں کے بل آگے کو جھکی اور سرگوشی میں مجھے کہا۔۔۔

"تم شکل سے خیراتیے لگتے ہو۔۔ یہ لو پچاس روپیہ اور اپنی پسند کا گفٹ خرید لینا اور ہاں اگلا گفٹ طمانچہ ہوگا۔"

"تو پھر۔۔۔؟"

"لنڈے سے پچاس روپے میں یہ طمانچہ خریدا اور پہنے پھر رہا ہوں۔۔۔ اور کیا نام ہے اس کا۔۔۔ سالا۔۔۔ نپولین کی اولاد۔۔ لیو۔۔۔ حیرتؔ تخلص کرتا ہے ایک روز کالج گراؤنڈ میں اس نے مجھے کہا تھا۔۔۔ Life is miserable۔۔ اس سالے کو کیا معلوم لائف کب Miserable ہوتی ہے؟ یہ اس وقت Miserable ہوتی ہے جب انسان طمانچہ پہن لیتا ہے۔۔۔ چھوڑو یار۔۔ سموسے کھائے جائیں۔"

ادریس علی خان حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عجیب متضاد پہلو دار شخصیت کا مالک ہے یہ۔۔۔!

اگلے روز یا شاید اُس سے اگلے روز۔۔۔ دن تو سارے ایک سے ہوتے ہیں۔۔۔ لمحہ لمحہ ماضی میں ڈھلتا دفن ہوتا وقت۔۔۔ سرکتا "حال"۔۔۔ نامعلوم "مستقبل"۔۔۔ اگلے روز۔۔۔ کوئی سا بھی دن ہو کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔؟

دھوپ تیز تھی۔

چار کی ٹولی لُڈو کھیل رہی تھی۔ دو مخروط چہرے والے لڑکے ہمیشہ کی مانند ''نوگیٹی'' کھیلنے میں مگن تھے۔ وہ سیمنٹ کے بنچ پر بیٹھا اوور کوٹ گود میں دھرے ادریس علی خان کے ساتھ ڈرافٹ کھیل رہا تھا۔ کچھ لڑکے کپڑے دھو کر سوکھنے کے لیے رسّی پر پھیلا رہے تھے۔

''آج ڈمپر موٹو غائب ہے۔۔۔'' ایک لڑکے نے کہا۔

''اسی لیے تو ملکی حالات ٹھیک لگ رہے ہیں۔ افواہیں پھیلانا بھی اس موٹو پر بس ہے۔''

ہوسٹل کی دوسری منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی میں ایک منچلے نے ڈیک پوری آواز میں کھول رکھا تھا۔ اچانک برآمدے کی مغربی سمت سے ڈمپر موٹو تیز تیز قدموں سے آتا دکھائی دیا۔ ریڈیو حسبِ معمول اس کے کان سے چپکا ہوا تھا۔

''لو۔۔۔ بھئی وہ آ گیا۔۔۔ اس کی چال بتا رہی ہے کہ عالمی حالات تباہی کے آخری سرے پر پہنچ چکے ہیں۔''

ڈمپر موٹو کی سانس پھولی ہوئی تھی۔۔۔ اس نے چیخ کر کہا۔۔۔ ''اوئے اُلو کے پٹھے سے کہو، ڈیک بند کرے۔۔۔'' نیچے سے ایک پتھر پھینک کر انہوں نے دوسری منزل والے کو متوجہ کیا اور ڈیک بند کرایا۔۔۔

''ڈمپر یار۔۔۔ خیریت تو ہے نا۔۔۔ تیری سانس کیوں پھولی ہوئی ہے۔۔۔؟''

''تم سب اپنے اپنے کھیل بند کرو۔۔۔'' ''نوگیٹی لُڈو'' ڈرافٹ۔۔۔ اور یہ موسیقی۔۔۔!''

''ہوا کیا ہے۔۔۔؟''

''ہم سب کو اجتماعی مات ہو گئی ہے۔۔۔'' اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

لان میں سناٹا چھا گیا۔۔۔ گہری اور دبیز چُپ۔۔۔!

☆☆☆

خودداری کی نیند

یہ 2007ء ہے۔

ترتیبِ وقت میں یہ سال قیامت تک نہیں پلٹے گا۔

اب کے برس بھی ایک شخص کا کھانستے کھانستے براحال ہوگیا۔ دونوں اطراف کی پسلیوں پراس نے ہاتھوں کا دباؤ ڈالا اور ایک لمبا سانس کھینچا۔ کہولت تو اس کے جسم میں کئی برس سے مقیم ہے لیکن قوتِ ارادی کی لاٹھی ٹیکتا وہ زندگی گھسیٹ رہا ہے۔ اُسے یقین ہے ایک روز موت نے آنا ہے اور مجھے لے جانا ہے لیکن زمین پر وہ اپنی زندگی کا بوجھ کسی اور پر ڈالنے کے حق میں نہیں۔ سفید ریش، چہرے پر پھیلا جُھریوں کا جال۔ ان جُھریوں میں عمر بھر کی مفلوک الحالی کا ڈیرہ ہے۔ رُخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں غربت میں بسر ہوتے شب و روز کی گواہ ہیں؟ اوائل عمر میں اللہ نے اُسے ایک بیٹا عطا کیا تھا۔۔۔ گوجِلّا۔۔۔ اس کی بیوی کا کہنا تھا۔

''یہ مجھ پر گیا ہے۔''

وہ مسکرا کر چپ ہو رہتا کہ اس کا رنگ گندمی تھا۔

بیٹے کی پیدائش پر اس کے گھر رشتہ داروں اور دوستوں کی مبارک باد کا میلہ لگا رہا تھا۔ اس کا ایک قریبی عزیز جس کی اولاد خوش حال تھی کہنے لگا۔

''خوش قسمت ہو بھائی۔ اللہ نومولود کی عمر دراز کرے تمہارے بڑھاپے کا سہارا ہو گیا۔''

''بھائی۔۔۔سب سے بڑا سہارا اللہ کا ہے۔ اولاد پر بھروسہ عبث ہے۔''

''لیکن بھائی دُنیا اسباب کے سہارے چل رہی ہے۔''

''اس سے انکار نہیں لیکن میرا یقین ہے اللہ کے سوا سب سہارے عارضی اور ناپائیدار ہیں۔''

بیٹا جب سکول میں داخل ہوا میاں بیوی خوش تھے۔ پہلے روز وہ اُسے سکول چھوڑنے گیا تو اس کی بیوی نے بوسیدہ لکڑی کے ٹوٹے ہوئے دورازے کے ادھ کھلے کواڑ سے آواز دے کر پوچھا۔۔۔

''آج کام پر نہیں جاؤ گے۔''

''بیٹے کو سکول پہنچا آؤں پھر نکلتا ہوں۔''

''اس کا گھر عُسرت کی منہ بولتی تصویر تھا لیکن کبھی کسی نے اُس کی زبان سے ایسا کلمہ نہ سنا جس سے ناشکری جھلکتی ہو۔۔۔گھر کیا تھا۔۔۔؟ ایک کچا کمرہ، چھت جس کا ٹیڑھی میڑھی لکڑی کی کڑیوں اور گھاس پھونس سے بنا تھا۔ دیواروں پر اس کی بیوی ہر سال مٹی کا تازہ لیپ کر دیا کرتی تھی، چھوٹا سا کچا صحن، داہنی جانب مٹّی کے چولہے، گرمیوں کے لیے ایک چھپر، صحن کے شمالی کونے میں لکڑیوں کا ڈھیر جو وہ اکثر جنگل سے چن لایا کرتا تھا۔۔۔!''

اس کی بیوی کبھی حرفِ شکایت زبان پر لاتی تو وہ تسلی کا مرہم نکال لاتا۔

''اللہ کی بندی۔۔۔ہم غریب امیروں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے اور

مولوی صاحب نے بتایا ہے قرآن میں صاف لکھا ہوا ہے کہ آخرت کا ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔'' اس کی بیوی سر پر دوپٹہ جما کر ٹھنڈی سانس بھرتی اور نم آنکھوں کے ساتھ کاموں میں جُت جاتی۔ وہ دونوں رات میں مونگ پھلی، ریوڑی، ٹافیاں اور بُھنے ہوئے چنوں کے پیکٹ بناتے اور صبح دم وہ نمازِ فجر کے بعد مسجد میں ہی سورج طلوع ہونے کا منتظر رہتا۔ اشراق کے نوافل ادا کرنے کے بعد گھر میں اکثر باسی روٹی سے ناشتہ کرتا اور کام پر نکل جاتا۔ مطمئن رہنا اُس کے مزاج کا حصہ ہو گیا۔ کبھی کوئی سوال اُٹھاتا تو وہ دھیمے لہجے میں کہتا۔

''بھائی۔۔۔ اُس کریم رب کا جتنا شکرادا کیا جائے کم ہے۔ دِن بھر میں اتنی بچت ہوجاتی ہے کہ روزانہ دال ساگ پکا لینا آسان ہوجاتا ہے۔ گھر میں لمبی بیماری کا روگ نہیں، مقروض ہم نہیں۔۔۔ اللہ سے اور کیا مانگیں۔ خوش قسمت ہیں ہم کوئی ایسا گھر ڈھونڈ دکھاؤ جہاں بیماری اور قرض کا عذاب نہ ہو۔ اللہ ہم سے راضی ہم اللہ سے راضی!''

''کتنا بڑا انعام ہے رب سوہنے کا جس نے ہمیں قرض اور مرض سے بچا رکھا ہے۔ چند ٹکوں کے لیے ناشکری کر کے ہم یہ نعمت کیوں گنوائیں۔۔۔''

زندگی اور وقت رواں رہتے ہیں۔ زندگی اپنا سفر مکمل کر کے پیوندِ خاک ہوجاتی ہے۔ وقت اپنی عمرِ رواں قیامت کے روز پوری کرے گا جب اس کے پیمانے بدلے جائیں گے۔ وقت جاری رہتا ہے، ہم گزر جاتے ہیں۔ وقت کے پیمانے سے صدیاں، زمانے اور نسلیں گزر جاتے ہیں لیکن یہ پیمانہ نہیں چھلکتا۔

اس کچے گھر میں جس کے صحن کی شمالی سمت والے کونے میں جنگل سے چُنی لکڑیوں کا ڈھیر تھا، کچے چولہے، چھپر اور ٹوٹا ہوا لکڑی کا کواڑ تھا۔ پوہ کی ایک یخ بستہ رات میں وقت نے بوسیدہ دروازے پر کچھ اس طور دستک دی کہ گھر اینٹ اینٹ لرز اُٹھا۔ صحن میں رکھی لکڑیوں کا ڈھیر تڑتڑ

جلنے لگا۔ چھپر کے گھونسلوں میں سے پرندوں نے خوف کی لپیٹ میں آ کر اُڑان پکڑی، ہینڈ پمپ کا پانی گر گیا۔ رات کا کوئی پہر تھا۔ اس کے بیٹے نے پیٹ درد کی شکایت کی۔ ماں نے دارچینی، پودینہ اور چھوٹی الائچی کا قہوہ بنا کر دیا لیکن درد پورے گھر میں پھیل گیا۔ اس کچی بستی میں ایک ہی حکیم تھا۔ وہاں جانے کے لیے اُس نے اپنے ہمسائے کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے ریڑھی میں گدھا جوت کر اُسے ہانک لگائی۔ ریڑھی پر بستر میں بیٹے کو لپیٹا۔

وہ یخ بستہ رات میں گھر سے نکلے۔ حکیم گہری نیند سے بمشکل بیدار ہوا۔ اس نے درد کی جگہ ٹٹولی۔۔۔ ناف کے گرد گھومتا ہوا پیٹ کے داہنی جانب اُترتا درد۔۔۔!

اسے اپینڈکس کہتے ہیں۔ صبح اسے فوری بڑے سرکاری ہسپتال لے جائیں۔

جانے رات انہوں نے درد میں کاٹی یا رات بھر درد نے انہیں کاٹا۔۔۔!

صبح بڑے سرکاری ہسپتال کی لمبی راہداریوں میں ڈاکٹر کو تلاش کرتے ہوئے موت نامعلوم سمت سے اس ریڑھی پر آہستگی سے اُتری۔ ریڑھی کو خالی پا کر موت نے ہسپتال کے صدر دروازے سے اندر جھانکا۔ سیمنٹ کے بینچ پر ایک مفلوک الحال عورت بیٹھی تھی۔ دو شخص بوسیدہ کپڑوں میں سرگرداں ڈاکٹر کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ موت کس کی تلاش میں تھی؟

موت نے پورے ہسپتال کا چکر لگایا۔ کمرہ کمرہ گھومی پھر صدر دروازے پر آئی۔ سیمنٹ کے سرد بنچ پر لیٹے بچے کو دیکھا جس کا سر غم زدہ ماں کی گود میں تھا۔ ماں جس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو انگارے بن چلے تھے۔ انگارے دہکتے رہے۔ موت نے قدم آگے بڑھایا اور چپکے سے غم زدہ ماں کی گود میں سر رکھے اُس کے درد سے بلبلاتے بیٹے کو اُٹھایا اور نامعلوم سمت روانہ ہو گئی۔۔۔

ہسپتال، ریڑھی اور گھر میں سنّاٹوں نے بسیرا کیا۔

وہی قافلے جو چند برس قبل مبارک باد دینے کو آئے تھے اب کی بار دُکھ بانٹنے آئے۔

''ایک جملہ جو ابھی زندہ تھا۔۔۔ بیٹے کے مرجانے کے بعد بھی!''

''اللہ نومولود کی عمر دراز کرے تمہارے بڑھاپے کا سہارا ہو گیا۔''

''بھائی سب سے بڑا سہارا اللہ کا ہے۔''

زندگی اور وقت رواں رہتے ہیں۔ زندگی اپنا سفر مکمل کر کے پیوندِ خاک ہو جاتی ہے لیکن جھریوں کا جنگل جس میں دُکھ بسیرا کرتے ہیں ابھی سفر میں ہے۔ وہ خمیدہ کمر ہو چکا ہے۔ زندگی تو کیا اب اس کے لیے اپنے جسم کا بوجھ سہارنا مشکل ہے۔ کل تلک وہ مضبوط بازوؤں میں لوہے کے ایک دائرہ نما کڑے میں، ریوڑیوں، ٹافیوں، مونگ پھلی اور بھنے ہوئے چنوں کے پیکٹ اُٹھائے بسوں، **ویگنوں** کے اڈوں سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن پر پہنچتا۔ آخری گاڑی کا انتظار بھی اسے گراں نہیں گزرتا تھا لیکن اب اشراق کے نوافل پڑھنے کے بعد وہ بہت دیر صحن میں دُھوپ سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اُس کے کندھے پر لوہے کا ایک گول کڑا باقی رہ گیا ہے جس میں سامانِ رزق پرو کر وہ قریبی پرائمری اسکول میں دِن گزارتا ہے۔ دوپہر سے پہلے کبھی سہ پہر ڈھلے وہ گول کڑا کندھے پر لٹکائے رکوع کی حالت میں بدن گھسٹتا واپس لوٹتا ہے۔ وہ بہت زیادہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ بینائی اس کی جواب دینے لگی ہے۔۔۔

یہ کس روز کی بات ہے؟

آج کی، گزرے کل کی، چند برس قبل کی یا صدیاں گزر چلی ہیں۔ نہیں معلوم۔۔۔!

میں نے کہا ہے نا۔۔۔ یہ 2007ء ہے۔

ترتیبِ وقت میں یہ برس قیامت تک نہیں پلٹے گا۔

میں ایک نامعلوم دِن کی ڈھلتی دُھوپ میں گھر سے نکلا۔ وہ مجھے نظر آیا اُس کے کاندھے پر جھولتے گول لوہے کے کڑے میں مونگ پھلی کے دو اور ریوڑیوں کا ایک پیکٹ تھا۔

میں نے کہا "بابا یہ مجھے دے دو۔۔۔" یہ کہہ کر میں نے اسے دس روپے کا نوٹ پکڑا دیا۔

تین پیکٹ مجھے پکڑانے کے بعد وہ اپنی داہنی بغلی جیب سے ریز گاری نکالنے لگا۔

"بابا۔۔۔رہنے دو۔۔۔کوئی بات نہیں۔"

"نہیں بیٹا۔۔۔ بالکل نہیں مَیں خیرات نہیں لیتا اس نے دو دو روپے کے دو سِکّے میری ہتھیلی پر رکھ دیے۔۔۔"

میری ہتھیلیاں آج بھی جل رہی ہیں۔

جیسے پوری دھرتی جل رہی ہو۔

ہتھیلیاں جلنے کے باوجود میری خودداری صدیوں کی نیند سے نہیں نکلی۔

☆☆☆

قدیمی کُرسی اور کتاب کی مرمّت

جنوری کی سرد صبح تھی۔ میں ایک بوسیدہ کرسی صحن میں ڈالے بیٹھا تھا۔ سرد ہوا ہڈیوں میں اُترتی تھی۔ یہ وہ دن تھے جن میں سردی کچھ دن اپنا پورا جوبن دکھاتی ہے۔ دھوپ بھی ٹھنڈی تھی لیکن میرا خیال تھا دوپہر تک سردی کی شدت کچھ کم ہوئی تو میں اپنا افسانہ مکمل کرلوں گا۔ افسانہ کئی روز سے مجھے مشکل میں ڈالے ہوئے تھا۔ ایک سرا پکڑتا تو دوسرا ہاتھ سے نکل جاتا۔ زندگی کا گورکھ دھندا بھی عجیب ہے۔ جس شعبے پر بھی گرفت کمزور ہو وہ ہاتھ سے پھسلنے لگتا ہے۔ وہ گھر ہو، بیوی بچے، نوکری یا روزمرہ کے معمولات ہوں۔

بچے صحن میں کھیل رہے تھے۔ دھوپ میں کُرسی ڈال کر جب بھی میں کتاب لے کر بیٹھوں میری بڑی بیٹی مجھ سے چائے کا ضرور پوچھتی ہے۔ وہ صحن میں ٹہلتے ہوئے نوٹس ہاتھ میں تھامے اپنا سبق یاد کر رہی تھی۔ یہ عادت اُس کی بچپن سے ہے کہ اُسے جب بھی سبق یاد کرنا ہو وہ ہمیشہ ٹہل کر یاد کیا کرتی ہے۔ بیٹی نے نہ صرف مجھ سے چائے کا پوچھا بلکہ سرد ہوا سے بچنے کے لیے مجھے کرسی دیوار کی اوٹ میں کرنے کے لیے کہا۔

مجھے کرسی دیوار کی اوٹ میں کر لینے دیجیے کہ سرد ہوا صحن سے گزر رہی ہے۔ ہوا، یاد،

عمر، ماضی اور خوشبو کو روکنا ممکن ہی کہاں ہوتا ہے اور یہ جو میں نے کرسی کو بوسیدہ لکھ دیا ہے یوں ہی نہیں لکھ دیا۔ آپ اس پر غور تو کر دیکھیں۔ یا شاید یہ میری عمر کا تقاضا ہے۔ میری ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو چلی ہیں۔ اپنی کسی بھی ہڈّی کو ہاتھ لگاتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔ وہ یقینی طور پر بُھر بھری ہو چکی ہوں گی۔ یہ بھی اچھا ہے ہڈیاں ہمیں نظر نہیں آتیں۔ یہ قدیم فولڈنگ کرسی وکٹورین عہد کی یاد دلاتی ہے۔ نانا جان پولیس میں ایس پی تھے۔ جب کوئٹہ سے ریٹائر ہو کر گاؤں لوٹے تھے تو چھ وکٹورین کرسیاں بھی سامان میں ساتھ تھیں۔ شعور سنبھالنے پر میں نے نانی امّاں سے چار کرسیاں مانگ لی تھیں۔ ننیہال کی یہ آخری نشانی میں نے اب تک سنبھال رکھی ہے۔ یہ عہدِ رفتہ ہے اسے صرف کرسی خیال نہ کیا جائے۔ کیا محبت صرف جان داروں سے کی جاتی ہے۔ میرا تعلق ان کرسیوں سے بھی صلہ رحمی کا ہے۔ دیوار کی اوٹ میں کرسی ڈال لینے سے قدرے سکون محسوس ہوا۔ اب مجھے فراغت تھی۔ خیال آیا میں نے رات افسانہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا اب یہ یاد نہیں ارادہ پایۂ تکمیل کو پہنچا یا نہیں۔۔۔؟ میں سرد دھوپ سے اُٹھ کر کتابوں کے کمرے میں آیا۔ میز پر خطوط، لیٹر پیڈ، ادبی جرائد اور کتابیں بکھری تھیں۔ میں نے ایک نظر ادبی جرائد پر ڈالی۔ میں ان کو حرف حرف پڑھ چکا تھا۔ خطوط کے بارے کچھ کہنا مشکل ہے۔ ان میں سے کتنے خطوط کے جواب میں لکھ چکا تھا اور کتنے میرے منتظر تھے؟ میں نے قلم اُٹھا کر افسانہ لکھنے کا ارادہ کیا اور پھر قلم واپس رکھ دیا۔ میں نے اپنے کمرے کے چہار اطراف رَیکوں میں سجی کتابوں پر ایک نظر ڈالی، مجھے اس وقت کون سی کتاب کا چناؤ کرنا چاہیے۔۔۔؟ میری نظر اچانک دیوان سنگھ مفتوں کی ''ناقابلِ فراموش'' پر جا ٹھہری۔ میں نے کتاب اٹھائی۔

یہ کیا۔۔۔؟ کتاب تو بوسیدہ ہو چکی تھی۔ اس کی جلد اکھڑ چکی تھی۔ کتاب کے اوراق زرد ہو چلے تھے۔ سرِ ورق پر دیوان سنگھ مفتوں کی تصویر دھندلا چکی تھی۔ میں نے نرمی سے کتاب کو

تھاما۔لائبریری سے باہر دھوپ میں آ کر اسے غور سے دیکھا۔تحریر ابھی نہیں دھندلائی تھی۔میں کرسی پر بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرنے لگا۔یہ کل کی کہانی ہے۔۔۔تیس برس پہلے راولپنڈی کے ایک بک اسٹال سے میں نے یہ کتاب خریدی تھی۔۔۔انہماک سے اس کا مطالعہ کیا تھا۔یہ دیوان سنگھ مفتوں کی خودنوشت ہے اور اس کا شمار اُن قابلِ قدر سوانح میں ہوتا ہے جو زندہ رہتی ہیں۔

لیکن یہ بوسیدہ کیوں ہوگئی ہے۔۔۔؟ میری ہڈیاں بُھر بھری ہوگئی ہیں اس لیے یہ مجھے کِرم خوردہ نظر آرہی ہے۔شاید اسے بھی دیمک چاٹ گئی ہے۔۔۔وقت کی دیمک کا کیا علاج۔۔۔؟ اپنی لائبریری کی ساری کتابوں کو پرکھنا چاہیے یہ تو ہمارا قیمتی ورثہ ہے اسے دیمک سے بچانا ہمارا فرض ہے۔

سرد دھوپ کی چند کرنیں میں نے مٹھی میں پکڑیں اور دوبارہ کتابوں کی دنیا میں داخل ہوا۔کتابوں کی روشنی میں مجھے ان کرنوں کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن زادِراہ کے لیے کچھ نہ کچھ تو ساتھ رکھنا تھا۔دیوان سنگھ مفتوں کی ''ناقابلِ فراموش'' کو میں نے میز پر ہی رہنے دیا۔ایک نظر پھر ہزاروں کتابوں پر ڈالی جو صدیوں سے میری رفیق ہیں۔تاریخ نے میرے پاؤں پکڑے۔میرے سامنے ریک میں ابوالقاسم فرشتہ کی ''تاریخِ فرشتہ'' تھی۔میں نے کتاب اٹھائی تو گتے کی جِلد ریک میں ہی رہ گئی۔کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔کتاب کی پشت پر گوند سوکھ چکی تھی۔سرِورق اور پسِ ورق کو اٹھا کر میں نے ان پر سے گرد جھاڑی۔تاریخی واقعات چیونٹیوں کی مانند قطار باندھے نظر آئے۔آپ کو فکر مندی کیوں ہو رہی ہے۔میرا قطعی یہ ارادہ نہیں کہ میں ابوالقاسم فرشتہ کی تاریخِ فرشتہ اور دیوان سنگھ مفتوں کی ناقابلِ فراموش سے واقعات کشید کر کے اس تحریر کو تاریخ بنا ڈالوں۔تاریخ تو ہم خود ہیں۔۔۔ہمارا کردار ہی تاریخ مرتب کرتا ہے۔ہمارے فیصلے تاریخ کے صفحات کو روشن کرتے ہیں یا عاقبت نااندیش ذہنوں کے فیصلے تاریکی کے غار میں

دھکیل دیتے ہیں۔اسی غار میں گرنے کے ڈر سے میں نے شاید مٹھی میں کرنیں پکڑ رکھی ہیں۔ میرا مسئلہ اس وقت تاریخ ہرگز نہیں بلکہ بوسیدگی میرا موضوع ہے۔

میں کتنی دیر کتابوں کے درمیان رہا۔ مجھے یاد نہیں۔ چوں کہ اس وقت میں نے گھڑی پر وقت نہیں دیکھا تھا اور نہ مجھے تاریخ نوٹ کرنا یاد رہی تھی اس لیے یہ چند ثانیوں کی بجائے صدیوں پر بھی محیط ہوسکتا ہے۔ میں نے ''تاریخِ فرشتہ'' کی اُکھڑی ہوئی جلد پر سے گرد صاف کی۔ لائبریری سے باہر صحن میں آنے لگا تو آسمان ابر آلود تھا۔ موسم کا کیا اعتبار۔۔۔؟ کتنی دیر میں بدل جائے۔ بادل گھرے ہو چلے تھے۔ تاریکی چھا رہی تھی۔ میں نے قدیمی کرسی کو فولڈ کیا اور لائبریری کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ بوندا باندی کے آثار تھے۔ تخلیقی کرب سے گزرنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔ اس لمحے تخلیقی وفور کی شدت ضرور تھی لیکن ہڈیوں میں درد اُترتا محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب طرح کی بے چینی تھی۔ سوچوں کی یلغار سے بچنے کے لیے میں نے فیصلہ کیا کہ بوسیدہ کتابوں کی مرمت کا کام کیا جائے۔ کسی جلد ساز سے فوری جلد بندی تو ممکن نہیں تھی لیکن ان کے ورق ورق ہونے اور بکھرنے سے پہلے میں نے سوچا ان کا حال اس بوڑھے لکڑہارے کی کہانی کی طرح نہ ہو جائے جس نے اپنے بچوں سے کہا تھا کہ لکڑیوں کے گٹھے کی مانند رہو گے تو کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا الگ الگ ہوئے تو سب ٹوٹ جاؤ گے۔

بارش تیز ہو گئی تھی۔۔۔

سرد ہوا کے تھپیڑوں کی آواز کمرے کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں کتابیں مرمت کر رہا تھا۔ بجلی کی کڑک بھی شدید تھی لیکن میں پوری دل جمعی سے اپنے کام میں مگن تھا۔ کتاب اس وقت میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی جب ایک آواز جو زوردار دھماکے کے مماثل تھی مجھے سنائی دی۔ موسلا دھار بارش میں باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ میں اُٹھا۔۔۔ معمولی سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو گھر کی

شمالی سمت والی دیوار زمین بوس ہو چکی تھی۔

دیوار کیا بارش سے گری ہے یا اس میں میرا بھی قصور نکلتا ہے۔۔۔؟

یہ قصور سراسر میرا ہے۔ اس لیے نہیں کہ میں کتاب مرمت کر رہا تھا اور دیوار کی جانب میرا دھیان نہیں تھا۔ اپنی غفلت اور کوتاہی کا اعتراف اس لیے کر رہا ہوں کہ دیواریں ایک روز میں زمین بوس نہیں ہوا کرتیں۔۔۔ گھر مہینوں میں مسمار نہیں ہوتے۔۔۔ دھیرے دھیرے انہیں وقت کی دیمک چاٹتی رہتی ہے۔۔۔ ہماری نا اہلی، عدم صلاحیت اور عقلی فقدان کا زنگ انہیں لے ڈوبتا ہے۔ یہ دیوار ایک عرصے سے کمزور چلی آ رہی تھی۔۔۔ مجھے خبر بھی کی گئی کی دیوار پر سیلن حملہ آور ہو چکی ہے لیکن میں مصنوعی مصروفیات کے خول میں بند رہا۔ اس کی مرمّت کا کام آج کل پر ٹالتا رہا مجھے بیوی نے کہا۔۔۔ بچوں نے توجہ دلائی۔۔۔ ملازمین نے اپنے حصے کی ذمہ داری نبھائی۔ وہ سب اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ گھر کا سربراہ ہونے کے ناطے یہ میرا فرض تھا۔ مالی اور انتظامی امور میرے ہاتھ میں تھے۔ تیز بارش میں دیوار کیا گری مجھے سبطِ علی صبا کا شعر یاد آ گیا۔

ے دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

پھر وہی کمزوری عود کر آئی۔ یہ وقت شعر گنگنانے کا نہیں تھا دیوار پر توجہ دینے کا تھا۔ دیوار کیا، گھر بھی بوسیدہ ہو چلا تھا اسے بھی بچانا تھا۔ میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور سوچنے لگا بارش تھم جائے تو دیوار کی مرمّت کے بارے میں کچھ عملی کام کیا جائے۔ میں دوبارہ کتابوں کی مرمّت میں جُت گیا۔۔۔ تاریخ کو بھی تو محفوظ کرنا تھا!

بارش نے بہت سے مسائل پیدا کر دیے چھت ٹپکنے لگی۔ صحن کا پانی برآمدے میں جمع

ہونے لگا۔اسی دوران بجلی چلی گئی۔اندھیرا چھا گیا میں نے مٹھی میں دبی کرنیں میز پر رکھ دیں۔ کتابیں مرمّت کر کے واپس اپنی جگہ پر رکھیں۔دیوار نے مسائل پیدا کر دیے تھے۔مسائل منہ پھاڑے کھڑے تھے اور وسائل کم تھے۔

جیب خالی تھی۔کیا دیوار کی مرمت کے لیے ادھار رقم لے لی جائے لیکن نہیں آمدن اتنی نہیں جس سے رقم پس انداز کر کے ادھار بعد میں چکایا جا سکے۔میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اب میں اتنی زیادہ محنت نہیں کر سکتا۔ادھار رقم سے دیوار تو مرمّت ہو جائے گی لیکن اگر میں قرض نہ لوٹا سکا تو میری اولاد مقروض جائے گی۔نسلوں کو مقروض چھوڑ کر مرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔

مجھے کیا کرنا چاہیے۔۔۔؟

میرے خیال میں افسانے کو ادھورا چھوڑ دینا چاہیے لیکن نہیں ادھوری تحریریں ذہن میں عذاب بن جاتی ہیں۔ادھوری اور نامکمل تخلیق کے کرب کو ایک سچا تخلیق کار ہی سمجھ سکتا ہے۔مجھے افسانہ ایک ہی نشست میں مکمل کرنا ہو گا۔میں ادھار رقم بھی نہیں لوں گا،جس طرح میں نے ’’تاریخِ فرشتہ‘‘ اور ’’ناقابلِ فراموش‘‘ خود مرمّت کی ہے۔میں دیوار بھی مرمّت کر لوں گا، مجھے قرض نہیں لینا ہے۔یہ میرا آخری اور حتمی فیصلہ ہے۔

میں لائبریری میں کھڑا تھا۔

صدیاں میرے اندر دھڑک رہی تھیں۔بارش تھم چکی تھی۔میں نے قدیمی فولڈنگ کرسی کو کھولا۔وہیں لائبریری میں کرسی پر جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں موند لیں، جو کتابیں مَیں نے مرمت کی تھیں وہ میری گود میں دھری تھیں۔آہٹ پر میں نے آنکھیں کھولیں تو میری بیٹی ہاتھ میں چائے کی پیالی لیے کھڑی تھی۔

’’ابو۔۔۔کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔‘‘

میں نے چونک کر بیٹی کو دیکھا۔۔۔

''بیٹا۔۔۔کچھ نہیں۔''

اُس نے میری گود میں سے کتاب اُٹھا کر اُسے غور سے دیکھا۔۔۔

''ابو کتاب کتنی بوسیدہ ہوگئی ہے۔''

''ہاں بیٹا۔لیکن میں نے مرمّت کر دی ہے اسے سنبھال کر رکھنا اب آپ کا کام ہے۔۔۔!''

بیٹی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی تھامتے ہوئے میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اُس کی نظر کرسی پر نہیں پڑی جسے دیمک مکمل طور پر چاٹ چکی تھی۔

☆☆☆

اُلٹے پاؤں

ہمارے پاؤں اُلٹے تھے فقط چلنے سے کیا ہوتا
بہت آگے گئے لیکن بہت پیچھے نکل آئے

عجیب کسلمندی سی رچی تھی اُس کی طبیعت میں۔۔۔جانے سفر پر نکلنا اُس کے مزاج پر اتنا گراں کیوں گزرتا تھا۔ایک گھریلو مصروفیت کی وجہ سے اسے میانوالی سے ملتان تک ہی تو جانا تھا۔تمام بڑے شہراس کے گاؤں سے قریباً تین ساڑھے تین سوکلومیٹر کی مسافت پر تھے۔لاہور اور ملتان تین سو پچاس کلومیٹراور راولپنڈی اسلام آباد دوسواسّی کلومیٹر کی دُوری پر تھے۔وہ گھر سے ایک دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر نکلا اور دوست سے کہا کہ میانوالی سے ملتان جانے والی شاہراہ پر وہ اسے ''گولے والا'' اسٹاپ پر چھوڑ آئے تاکہ وہ وہاں سے بس پکڑ سکے۔موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہی اسے خیال آیا میں تو ہمیشہ سے سفر میں ہوں۔زندگی ایک سفر ہے جس روز پیدا ہوا تھا اسی دن سے یہ سفر جاری ہے وقت کی آری عمر کو کاٹتی چلی جارہی ہے۔ایک روز یہ درخت دھڑام سے زمین پر آرہے گا اور دیمک کی خوراک بن جائے گا۔یہ روز کا سفر بھی بھلا کبھی اس کائنات میں تھما ہے۔آنکھ کھلنے پر مشقت کا سفر کھینچنا اور رات گئے چارپائی پر چند گھنٹوں کا آرام، وہ بھی نصیب میں ہوتو وگرنہ موجودہ نسلِ انسانی جو زمین پر سانس کھینچ رہی ہے وہ نیند کی ادویہ کے سہارے

مصنوعی نیند لیتی ہے۔۔۔

یہ ''گولے والا'' ہے بڑی شاہراہ پر ایک چھوٹا سا قصباتی اسٹاپ، تین چار چھپر ہوٹل، مشرقی سمت ایک چھپر کے نیچے کسی نے لقمہ کمانے کے لیے بلیرڈ ٹیبل لگا رکھی ہے جس پر پاس کے دیہات سے یا وہ ٹیکسی ڈرائیور جو گولے والا اسٹاپ پر سارا دن سواری کا انتظار کھینچتے ہیں، بلیرڈ کھیلتے نظر آتے ہیں۔ ساتھ میں ایک کار ڈیلر کی دکان ہے جس میں وہ سارا دن نوگیٹی یا لڈو کھیلتے ہیں۔ اکا دکا دکانیں منیاری کی بھی ہیں۔ موٹر سائیکل پر اسے جو دوست چھوڑنے آیا تھا وہ اسی لمحے اسے اتار کر واپس مڑ گیا تھا۔ اس نے شاہراہ پر شمال سے جنوب جانے والی گاڑیوں پر نظر رکھنے کے لیے ایک ایسے چھپر ہوٹل کا انتخاب کیا جہاں ٹوٹی چار پائی پر بیٹھا وہ چائے سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ شمالی سمت سے آنے والی ٹریفک پر نظر بھی رکھ سکتا تھا۔ اس نے چائے کی ایک پیالی کا کہا اور چار پائی کے کونے پر ٹک گیا۔

''گولے والا اسٹاپ'' پر تیز میٹھے اور تیز پتی والی چائے کے دوران اسے وہ پاگل بھی یاد آیا جو ایک پتھر ہاتھ میں تولے سارا دن گھومتا رہتا تھا۔۔ منہ سے ٹپکتی رالیں، میلے چیکٹ کپڑے، چند مخصوص جملے۔۔۔ جو اس کا معمول تھے۔

''سارے شیشے توڑ دوں گا۔۔۔''

''ٹریفک جام کر کے رکھ دوں گا۔۔۔''

''پاکستان کی پولیس کو بحرالکاہل میں ڈبو دوں گا۔''

''یہ دوائی کس ''کریانہ سٹور'' سے ملتی ہے۔۔۔؟''

یہ پتھر دیکھ رہے ہو۔۔۔ یہ بم ہے۔۔۔ بم۔۔۔ کوئی میرے قریب تو آ کے دیکھے۔۔۔ مار دوں گا۔۔۔

''گولے والا'' میری ریاست ہے کوئی اور مائی کا لعل آ کے تو دیکھے۔۔۔ بم مار دوں گا۔۔۔ یہاں پر صرف میرا سکہ چلے گا کیوں کہ میرے پاس پتھر ہے!

ایم اے پاس وہ پاگل جو ایک شب اپنی جاں بہ لب بیٹی کے لیے گھر سے دوائی لینے کو نکلا تھا، اسی لمحے کہیں قریبی گھر سے پولیس نے چھاپہ مار کر چند جواریوں کو پکڑا اور گلی میں جاتے اسے دیکھ کر اس کی ہر دلیل کو نظر انداز کر کے اسے بھی گاڑی میں پھینک ''دارلامن'' لے گئے۔ اس کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔ تیسرے روز جب اسے رہا کیا گیا تو اس وقت تک اس کی بیٹی زندگی کی قید سے رہائی پا چکی تھی۔۔۔ وہ بھی اسی لمحے حواس کے بوجھ سے رہائی پا کے گلیوں اور بازاروں میں کاغذ چننے لگا۔ کاغذ کے ہر ٹکڑے پر اس کی بیٹی کا نسخہ لکھا تھا۔۔۔ وہی بم جو وہ ہاتھ میں تولتا پھرتا تھا اس کی کیا جان لیتا۔ ایک صبح اس نے ملتان سے آنے والی کوچ جو گولے والا سے گزر رہی تھی اس پر پتھر تولا، شاید ڈرائیور نیا تھا جسے اس پاگل سے شناسائی نہ تھی، اس نے پاگل کے بچانے کو اسٹیرنگ داہنی جانب کاٹا اور سامنے سے آنے والی تھری سیٹر بس سے جا ٹکرایا۔۔۔ دھماکے کی آواز دُور دُور تک سنی گئی، بائیس جانیں چلی گئیں، بائیس گھر اجڑ گئے لیکن وہ تو پاگل تھا، اسے کیا معلوم کیا حادثہ گزرا ہے۔۔۔ اسے پولیس پکڑ لے گئی۔۔۔

میرے خیال میں یہ جو سامنے سے بس آ رہی ہے، جس کا ماتھا سجا ہوا ہے اور چمک رہا ہے یہ وہی بس ہے جس کا مجھے انتظار ہے، ڈرائیور کا ہاتھ مسلسل ہارن پر ہے اور ہارن اس بات کی علامت ہے کہ بس میں سیٹیں خالی ہیں۔۔۔ دیکھیے نا۔۔۔ میں نے چھپر ہوٹل کے نیچے بیٹھ کر آپ سے باتیں کی ہیں۔۔ آیئے آپ بھی میرے ساتھ چلیے آپ بور نہیں ہوں گے۔۔۔ بریک لگنے کی چرچراہٹ، فرنٹ ڈور کا ڈنڈا تھامے آدھا باہر لٹکتا کنڈکٹر، اس کی آواز کی لپک، سرائے مہاجر، چوک اعظم، چوک مُنڈا، مظفر گڑھ، ملتان اے۔۔۔!

''استاد جی۔۔۔ایک سواری ہے۔''

''یار میں نے ملتان جانا ہے۔''

''آؤ جی آؤ۔۔۔ڈرائیور کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھو۔۔۔''اس نے ایک سواری جسے قریباً بیس کلومیٹر بعد چاندنی چوک اترنا تھا، وہاں سے اٹھ کے پیچھے جا بیٹھنے کو کہا، سواری نے برا سا منہ بنایا اور ناگواری سے اٹھ کر پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔۔۔وہ ڈرائیور سے پچھلی سیٹ پر جم کے بیٹھا اور خیالوں میں کھونے سے پہلے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ڈرائیور کے بال تیل سے چپڑے ہوئے اور مانگ درمیان سے نکلی ہوئی، خشخشی ڈاڑھی کو اس نے خوب جما کر بٹھایا ہوا تھا، بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں اس نے موٹے نگ والی تین انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں، آنکھوں میں سرمے کی دھاریں۔۔۔کنڈکٹر نکلتے ہوئے قد کا ایک کرخت خال وخد کا نوجوان تھا، شیو بڑھی ہوئی، دائیں کان میں پیلے رنگ کی بال پوائنٹ اس نے اڑس رکھی تھی، کپڑوں کا رنگ میل خورا، جوتی پھٹی ہوئی۔۔۔ساتھ میں ایک ہیلپر بھی تھا۔۔ایک پندرہ سولہ سال کا بچہ، چہرے پر تکان اور نیند سے بوجھل آنکھیں، اس کے کپڑوں اور گردن پر جمی میل کا رنگ ایک سا تھا۔لگتا تھا اسے بستر سے کھینچ کر بس میں ڈال لیا گیا۔

چاندی چوک کے اسٹاپ پر کچھ سواریاں اُتریں کچھ نئے مسافر ہم سفر ہوئے۔۔۔بس چلتی رہی۔۔۔یہ ایک ریگستانی پٹی ہے، سرائے مہاجر کے بعد ایک جگہ اچانک بس رکی، ڈرائیور چھلانگ لگا کے اترا اور سڑک پار کر کے جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا

''استاد کہاں گیا۔۔۔؟''

''پیشاب کرنے گیا ہے۔۔۔''

ایک ایک کر کے سواریاں بس سے اُتریں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چلی گئیں۔۔۔

اس موئے ڈرائیور کو میں نے کہا تھا کہ ''بچے نے پیشاب کرنا ہے اس وقت گاڑی نہیں روکی۔۔۔''

ہیلپر۔۔۔جسے کنڈکٹر ''چھوٹا'' کہہ کر پکارتا تھا۔۔

''اوئے چھوٹے'' ٹائر ٹھوک بجا کے دیکھ لے۔۔۔

سواریاں واپس بیٹھ چکی تھیں، چھوٹے نے سارے ٹائروں کو ٹھوک بجا کے دیکھا اور آواز لگائی۔۔۔''استاد ڈبل اے۔۔۔''

یہ ''چوک اعظم'' کا ایک ٹرک اڈہ ہوٹل ہے۔۔۔سفر کے دوران سارے ہوٹل ایک سے ہوتے ہیں۔۔ایسے ہوٹلوں پر مناسب داموں میں کھانا کھایا جا سکتا ہے، چائے پی جا سکتی ہے، کشادہ برآمدوں میں بچھی بڑی بڑی چارپائیوں پر کمر سیدھی کی جا سکتی ہے۔پاکستان میں سفر کے دوران کچھ شاہراہوں پر سواریوں کی جیب خالی کرنے کے لیے لگژری ہوٹلوں کا قیام عمل میں آیا لیکن وہاں اِکّا دُکّا کاریں ہی کھڑی دیکھنے کو ملتی ہیں۔۔۔عوامی ہوٹلوں کا آباد ہونا ہماری سادگی اور سفید پوشی کا مظہر ہے۔ہم ایک ترقی پذیر ملک کے شہری ہیں۔۔۔

آپ کے چہرے کے آثار بتا رہے ہیں کہ آپ اکتاہٹ کا شکار ہونے لگے ہیں۔۔۔

دیکھیے آدھا سفر مکمل ہوا۔۔آدھا باقی ہے۔۔۔تھکاوٹ تو سفر میں ہو جاتی ہے۔۔۔منزل پر پہنچ کر سانس لے لیں گے۔

اب ایک نیا موڑ ہے۔۔۔ذرا جھانک کر تو دیکھیے۔۔۔! پیٹ پوجا کے بعد سواریاں اپنی اپنی سیٹ پر اطمینان سے بیٹھی ڈرائیور کا انتظار کر رہی ہیں ایک دو مسافر ابھی بس کے ساتھ ٹیک لگائے سگریٹ پی رہے ہیں۔ایک سواری جیب سے پرس نکالے ہوٹل والے کو اپنا بل ادا کر رہی ہے۔سامنے چند سواریاں نمازِ ظہر ادا کر کے نکل رہی ہیں۔

ڈرائیور نے سیٹ سنبھالی۔۔۔

ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ ڈالا۔۔۔بار بار ہارن بجایا تاکہ کوئی سواری باہر رہ نہ جائے۔۔۔

تحیّر نے اس لمحے اسے لپیٹ میں لیا جب اس کی نظر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ڈرائیور کے چہرے پر پڑی۔اسے اپنی بینائی پر شک ہوا اُس نے ایک بار باہر کے منظر پر نظر ڈالی، ایک چرواہا اپنی بھیڑیں ہانکنے لیے جا رہا تھا، ایک گدھا گاڑی پر کسی مریض کو لٹا کر شاید ڈسپنسری لے جایا جا رہا تھا، چند بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔۔۔اس نے اپنے من میں جھانکا، اندر باہر کے منظر یکساں تھے۔یہ ڈرائیور وہ نہیں جو میانوالی سے اس سیٹ پر بیٹھا تھا اور گولے والا سے وہ اس کے سنگ سفر میں تھا۔۔۔اب ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سندھی ٹوپی والا درمیانے قد کا شخص تھا۔ وہ پہلے والا ڈرائیور کہاں گیا۔۔۔؟ یہ کہاں سے آیا۔۔۔اسے کس نے اجازت دی ہے کہ یہ ہماری بس چلائے۔۔۔کیا یہ اپنے فن میں ماہر ہے۔۔۔؟ سواریوں میں چہ مگویاں جاری تھیں، مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ۔۔۔

بس چلی تو اس کے انجن سے عجیب و غریب گڑگڑاہٹ کی آوازیں نمودار ہونے لگیں۔۔۔شاید کوئی فنی خرابی ہے۔۔۔؟

ڈرائیور کیوں بدلا۔۔۔؟

بس کی پچھلی سیٹ پر ایک مخبوط الحواس سواری جس کی شکل اس پاگل سے مشابہت رکھتی ہے جو گولے والا میں پتھر تو لے گھوما کرتا تھا۔اس نے کہا۔

''بس میں کوئی فنی خرابی ہے۔۔۔بس روکو۔۔۔بس روکو۔''

لیکن اس کی بات پر کسی نے کیا توجہ دینا تھی۔۔۔مظفر گڑھ سے پہلے بگا شیر کے قریب بس

رک گئی۔۔۔"چھوٹے" نے لکڑی کے ٹول بکس سے اوزار نکالے، ڈرائیور اور کنڈیکٹر بس کے نیچے لیٹ کر اوزاروں کی مدد سے جس حد تک ممکن تھا، اس کی مرمت کرنے کے بعد دوبارہ ہاتھ پونچھ کر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔۔۔بس چلی تو وہ سہم کر اپنے آپ میں سمٹنے لگا۔۔۔اب کے ڈرائیونگ سیٹ پر جو ڈرائیور تھا، اس کے سر کے اطراف میں چند بال تھے، اسے گنجا کہا جا سکتا ہے۔۔۔اس کے چہرے پر اطمینان اور مسکراہٹ تھی۔۔۔اس نے سواریوں سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔

"فکرمندی کی کوئی بات نہیں۔۔۔گاڑی میں فالٹ معمولی ہے، مظفر گڑھ قریب ہے ہم وہاں سے کسی میکینک کو دکھا لیں گے۔"

"ڈرائیور پھر کیوں بدل دیا گیا۔۔۔؟"

"یار تمہیں کیا۔۔۔بس چل رہی ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔"

"بھروسہ تو مکمل اللہ پر ہے یار لیکن کوئی اناڑی سیٹ پر بیٹھ گیا تو ہم سب بس سمیت جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔"

"بگا شیر" سے "مظفر گڑھ" کی مسافت چند کلومیٹر تھی۔۔۔وہاں ایک ورکشاپ کے سامنے بس جا رکی۔ مکینک اوزار لے کر بس کے نیچے گھس گیا۔ ڈرائیور سامنے ایک ہوٹل پر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ سواریوں میں سے کسی نے ایک کھوکے سے پان سپاریاں اور کسی نے ریڑھی سے فروٹ خرید کر وقت گزارنا شروع کیا۔ چھوٹے نے ڈول میں پانی بھر کے ریڈی ایٹر میں ڈالا۔ بس جب مظفر گڑھ سے نکلی تو حبس بڑھ گیا۔

"استاد! اے۔سی چلاؤ۔۔۔دم گھُٹ رہا ہے۔"

"ایئر کنڈیشن کام چھوڑ گیا ہے۔"

چناب پُل کراس کرنے تک بس میں حبس اتنا بڑھ گیا کہ سواریاں چلّا اٹھیں۔۔۔

''استاد۔۔۔کچھ کرو نہیں تو ہم مر جائیں گے۔۔۔''

اغلب گمان یہی ہے کہ جب مظفر گڑھ سے بس نکلی تو جو ڈرائیور سامنے کھوکے پر چائے پی رہا تھا وہ وہیں رہ گیا۔۔۔کیوں کہ اِس وقت ایک باوردی ڈرائیور نے سیٹ سنبھال رکھی ہے۔۔۔یہ بھی معلوم نہیں۔۔۔پہلے ڈرائیوروں کی مانند اس نے کب کیسے یہ سیٹ سنبھالی۔۔۔؟

اس نے ساتھ بیٹھی سواری کو ٹہوکا دیا اور پوچھا۔

''بھائی۔۔۔یہ باوردی ڈرائیور کب اس سیٹ پر بیٹھا۔''

''پتا نہیں یار۔۔۔کیا یہ کوئی ہم سے پوچھ کر بیٹھتے ہیں۔'' اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

حبس کی وجہ سے سواریاں پسینے میں شرابور ہونے لگی تھیں۔۔۔کچھ نے گریبان کے بٹن کھول دیے۔۔۔ایک بار پھر بھنبھناہٹ سی اور مبہم گفتگو، جس کا کوئی مفہوم سمجھ میں آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔۔۔شاید یہ حبس کا اثر تھا۔۔۔!

''بھائی کون سا شہر ہے۔۔۔؟''

''سکھر۔۔۔سکھر ہے۔''

''یا خدا۔۔۔میانوالی ملتان روڈ پر سکھر کہاں سے ٹپک پڑا۔۔۔؟''

''ابھی کوئٹہ کتنا دور ہے۔۔۔'' ایک بوڑھے شخص نے پوچھا۔

''یار۔۔۔مجھے تو پشاور اُترنا تھا۔''

''کیا۔۔۔لاہور آنے والا ہے بھائی۔۔۔؟''

''جانے کراچی پہنچنے تک ابھی یہ بس کتنی دیر لے گی۔۔۔؟''

''اتا بھیا۔۔۔کیا دِلّی آ گئی۔۔۔؟''

''دِلّی۔۔۔؟ کیا دماغ ٹھکانے ہے تیرا۔۔۔؟''

''یار میری ضعیف پھوپھی وہاں میرا انتظار کر رہی ہے۔۔۔''

''کیا واہگہ باڈر ہم کراس کر آئے۔۔۔ مجھے ''کرنال'' کی خوشبو آ رہی ہے۔۔۔'' ایک انتہائی ضعیف اور خمیدہ کمر شخص نے پوچھا۔

''بابا جی۔۔۔جن شہروں کا آپ نام لے رہے ہیں وہ ہندستان میں ہیں۔''

''ہمیں کس بس میں سوار کرا دیا گیا ہے۔۔۔؟''

وہ ایک شخص جو ''گولے والا'' سے سوار ہوا تھا اور جسے کنڈیکٹر نے ڈرائیور کی پچھلی نشست پر بیٹھنے کو جگہ دی تھی۔۔۔اس کا خیال تھا وہ مکمل ہوش میں ہے اور باقی سواریاں حبس کی وجہ سے اول فول بک رہی ہیں۔۔۔اس نے بہت غور سے باہر کے منظروں کو جانچا۔۔۔

بس فتح پور سیکری سے گزر رہی تھی۔۔۔''مغلِ اعظم''۔۔۔ہاتھیوں کے پاؤں کی دھمک۔۔۔باادب، ہوشیار باش، نگاہ روبرو۔۔۔!

اسے یقین ہو گیا کہ اس کے حواس ابھی سلامت ہیں۔۔۔وہ ''گولے والا'' سے سوار ہوا تھا، چوک اعظم، اسلام آباد، پنڈی بھٹیاں، روات اور اب بس فتح پور سیکری سے گزر رہی ہے۔

ممبئی، کولکتہ، کانپور، دِلّی، تلہ گنگ، فتح جنگ، کراچی، لاہور، جہلم سے ہوتے ہوئے یہ بس اسلام آباد پہنچے گی۔۔۔رواں دواں بس ایک جھٹکے سے رکی۔ ''چھوٹے'' نے سواری اُتاری اور بس کا دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ یہ کوئی ایسی بڑی غلطی نہ تھی لیکن کنڈکٹر نے پوری توانائی سے ایک زناٹے دار تھپڑ ''چھوٹے'' کو جڑ دیا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ سب سواریوں نے اپنے اپنے گال پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اس نے بھی اپنا چہرہ ٹٹولا وہاں نشان اور جلن تھی لیکن۔۔۔تھپڑ کی تو خیر تھی۔۔۔سب

سواریوں نے دیکھا ''چھوٹے'' کا چہرہ ہر طرح کے تاثر سے عاری ہے۔ چہرے پر درد، کرب اور دکھ کا کوئی پرتو نہیں تھا۔۔۔ ایک مکمل سپاٹ چہرہ۔۔۔ وہاں کوئی آنسو اُترا، نہ احتجاج،۔۔۔ صدیوں سے طمانچوں کا عادی چہرہ جیسے روبوٹ۔۔۔

حبس اور طمانچے سے بس میں موجود سواریاں دم گھُٹنے سے مر گئی تھیں۔۔۔ یا۔۔۔ شاید ان میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہو۔۔۔؟

آخری بار ایک سواری کو اخبار کا صفحہ پلٹتے دیکھا گیا تھا۔۔۔

باوردی ڈرائیور آرام سے گاڑی چلا رہا ہے۔۔۔!

آپ کو یاد ہے نا۔۔۔ وہ ایک مسافر جو ''گولے والا'' بس اسٹاپ سے سوار ہوا تھا۔۔۔ وہ غنودگی کی کیفیت میں ہے۔۔۔!

''کیا آپ کو بھی اونگھ نے آلیا ہے۔۔۔؟''

''کوئی تو بولے۔۔۔ سناٹے میں دم گھُٹ چلا ہے۔

کیا بس میں کوئی ذِی روح ہے۔۔۔؟''

☆☆☆

لرزیدہ لمحوں کا تاوان

جس روز اس نے اپنی ریٹائرمنٹ کی الوداعی پارٹی میں شرکت کی۔ اس کے گلے میں ہار تھے اور ہال میں تالیوں کی اُداس گونج! اُس کے ساتھیوں نے ڈھول اور شہنائی کا انتظام کر کے اُسے عزت دی اور سب اُس کے گھر تک قافلے کی صورت پہنچے، رات میں وہ میٹھی نیند سویا۔ اگلی صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ تنہائی اُتری اور آکاس بیل کی طرح اس کے وجود کے ساتھ لپٹ گئی۔ وہ دِن بہ دِن مرجھانے لگا۔ عمر کے اس پیمانے نے اُس سے مصروفیت چھین کر اُسے تنہا کر دیا۔ اُسے وقت گزارنے کو کوئی مشغلہ ہاتھ نہ آ رہا تھا۔۔۔ گیٹ کے باہر، کرسی ڈال کر وہ دِن بھر لوگوں کو تکتا، ماضی میں ڈوب جاتا، اُکتا کر کبھی اندر جا بیٹھتا ایک دِن وہ دوپہر میں بہو کے کہنے پر کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرنے کو بستر پر لیٹا تو ٹیلی فون کی گھنٹی نے کمرے کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کیا۔ وہ یکسوئی سے اپنے مشاغل میں منہمک تھا۔ گھنٹی کی آواز اس پر گراں گزر رہی تھی لیکن فون کرنے والے نے شاید بات کرنے کی قسم کھالی تھی۔ وہ بادلِ ناخواستہ اُٹھا پلنگ سے میز تک کا فاصلہ پاٹنا اُسے عذاب لگ رہا تھا۔ اس کے دونوں گھٹنوں میں کئی روز سے پرانا درد عود

کر آیا تھا۔ جب تلک اس نے فاصلہ سمیٹا فون خاموش ہو گیا۔ میز کے کونے پر ہتھیلی ٹکا کر اس نے اپنے بھاری بھر کم وجود کو سہارا دیا فربہی سے اس کا سانس پھولنے لگا تھا اسے یقین تھا گھنٹی دوبارہ بجے گی۔ سانس درست کرتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ یہ وہی خاتون نہ ہو جس کا چند روز پہلے فون آیا تھا۔ آواز غیر مانوس تھی لہجے کے بارے میں وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا لیکن عجیب چلبلا پن تھا آواز میں!

''میں پوچھ سکتا ہوں محترمہ آپ کون ہیں؟''

''مجھے اتنی جلد فراموش کر دیا؟''

''خاتون مجھے یہ تو بتایئے آپ ہیں کون؟ آپ نے شاید غلط نمبر ڈائل کیا ہے۔''

''یہ نمبر وہی ہے جو میں نے ڈائل کرنا تھا اور کیا ہے۔''

''کام بتایئے!''

''کیا میں آج بھی تمہارے من میں بسی ہوں۔''

''خاتون! من میں تو ایک دنیا آباد ہے آپ اپنا تعارف تو کرا دیجیے۔''

''لیکن میں دنیا نہیں ہوں۔''

''مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا ہم عمر کے کس حصے میں متعارف ہوئے تھے۔''

''مجھے یاد ہے میں نے بچپن کے گُڈیوں پٹولوں کے ساتھ یادیں بھی سنبھال رکھی ہیں۔''

''خاتون میری عمر پینسٹھ برس سے متجاوز ہے میں ایک ریٹائرڈ زندگی جی رہا ہوں!''

''زندگی سے تو ابھی آپ ریٹائر نہیں ہوئے پھر ریٹائرڈ زندگی چہ معنی دارد۔''

''محترمہ! اس عمر میں میرا چین مجھ سے نہ چھینئے۔''

''میں تو چین تمہیں لوٹانے آئی ہوں۔''

''تعارف تو کرا دو۔''

''میں صرف تمہاری ہوں۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کر پاؤں گا۔''

''تم نے بچپن میں مجھ سے کب اتفاق کیا تھا۔۔۔مزاج تو نہیں بدلتے نا۔۔۔!''

ٹرن ٹرن ن ن ٹرن ن ن۔۔۔

بدن کو میز کے کونے اور ہتھیلی نے سہارے رکھا۔۔۔

''ہیلو۔۔۔''

''فون اُٹھانے میں اتنی دیر کیوں کر دیتے ہو۔''

''جوڑوں کا مریض ہوں۔''

''میں مریضِ محبت ہوں۔غم اور محبت کے مفاہیم تم پر کبھی نہ کھلے۔میں نے راکھ ہو کر زندگی گزاری ہے۔تم نے کبھی پلٹ کر خبر ہی نہ لی مجھ سے پوچھو۔۔۔نا میں نے عمر کیسے کاٹی؟عورت کے بارے جانے کب کہاں اور کس نے یہ جملہ کہا کہ وہ زندگی میں ایک بار پیار کرتی ہے۔ تمہارے بعد میں نے چار پانچ عشق کیے۔صرف تمہیں بھلانے کے لیے اس سے پہلے کہ تم مجھے ٹوک کر سوال کرو کہ عشق کوئی کاروبار تھا جو میں نے چار پانچ بار کیا۔یہ تجربہ میں نے صرف اس لیے ضروری سمجھا کہ شادی کے بعد میں نے اپنا بدن خاوند کو سونپ دیا۔شکر ہے اس کی سوچ ہی نرم وگداز گورا چٹّا بدن حاصل کرنے تک تھی وہ میرے من میں سوئی ہوئی عورت کو نہ جگا سکا اور بدن سے لذت کشید کر کے خوش ہوتا رہا۔میں مشین کی طرح بچے جنتی چلی گئی۔سات بچوں میں سے چار اللہ نے سنبھال لیے تین کو میں نے پال نکالا۔میرا خیال تھا شادی کے بعد میں تمہیں یکسر فراموش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔بچوں میں کھو جاؤں گی۔جب مجھے تیری یاد نے بے کل کیا تو میں نے

ایک ایسے شخص کی طرف قدم بڑھائے جس کے خدوخال تم سے ملتے تھے لیکن تیری یاد کی خوشبو پھر بھی مجھے کھینچتی رہی۔ کچی عمر کی محبت اتنی پکی ہوگی میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ تیرے بعد چار پانچ عشق تجھے فراموش کرنے کی سعی لا حاصل ٹھہرے!''

''خاتون۔۔۔آپ نفسیاتی مریضہ تو نہیں!''

''بالکل نہیں۔''

''دیکھیے خاتون! میری زندگی میں خلل مت ڈالیے، اگر آپ کی کہانی سچّی ہے تو یقینی طور پر آپ کی زندگی میں کوئی ایسا شخص آیا ہوگا لیکن وہ میں ہرگز نہیں۔ آپ مجھ غریب کو معاف رکھیے۔''

''ہائے۔۔۔تم نے مجھے واقعی فراموش کر ڈالا۔ تم مرد ہو۔ تم کیا جانو آگ جو ایک عورت کے من میں سلگتی ہے۔ اس تپش میں جھلستی وہ راکھ ہو جاتی ہے۔ عورت صرف دُکھ جھیلنے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ تمہیں میں کیسے یقین دلاؤں شادی ایک الگ بندھن ہے، رُوح ایک الگ سوز ہے۔ قصور تو سارا میرا ہے وہ خط مجھے تمہیں ہاتھ میں تھمانا چاہیے تھا۔''

''کون سا خط۔۔۔خاتونِ محترم۔''

''وہی خط جس میں دِل رُوح اور جذبات لپیٹ کر میں نے تمہاری کتاب میں رکھ دیا تھا۔''

''یا خدا۔۔۔خاتون آپ مجھے پاگل کر دیں گی۔ اگر آپ کو کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جسے آپ فون پر اپنے دُکھ سنانے کی خواہش مند ہیں تو کوئی اور دروازہ دیکھیے میں گور کنارے بیٹھا ہوں آج مرے کل دوسرا دِن میرے حال پر رحم کریں۔''

''ظالم۔۔۔یہ تو پوچھ لیا ہوتا میں نے خط کون سی کتاب میں رکھا تھا؟''

''اچھا۔۔۔خاتونِ مکرم۔۔۔بتایئے کون سی کتاب میں محبت نامہ آپ نے رکھا تھا؟''

''تم ایف ایس سی میں تھے۔ فزکس کی کتاب میں رکھا تھا میں نے۔''

''یاد آیا۔۔۔؟''

''خاک یاد آئے گا محترمہ۔۔۔میں آرٹس کا طالبِ علم تھا۔''

''ہائے اللہ۔۔۔میں مرگئی۔۔۔وہ میں نے کہیں تمہارے بھائی کی کتاب میں تو نہیں رکھ دیا تھا۔''

''خاتونِ محترم۔۔۔''

''تم جان کہہ کر نہیں پکار سکتے۔''

''خاتون۔۔۔خوفِ خدا۔۔۔یہ عمر ہے میری کسی کو جان کہہ کر پکارنے کی۔''

''ہائے۔۔۔ہائے۔۔۔اس وقت تو تھی نا۔۔۔جب میں نے خط کتاب میں رکھا تھا۔ میری بدقسمتی کاش میں نے تمہیں بھلا دیا ہوتا لیکن کیا کیجیے جسے انسان اُٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے ہر لمحے جاگتی آنکھوں دیکھے، اُسے کیسے فراموش کیا جائے۔''

''اس وقت آپ کی عمر کیا تھی۔۔۔''

''تمہیں خط مِل جائے تو عمر بھی جان لو گے۔ڈھونڈو تو سہی شاید کہیں مل جائے اور مرنے سے پہلے یہ خوشی تو دیکھ لوں کہ میں جس نے کہا تھا میں صرف تمہاری ہوں تمہیں یقین دلا جاؤں۔۔۔''

فون بند ہوگیا۔۔۔اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا۔لمبی سانس لی۔چشمہ اُٹھا کے آنکھوں پر جمایا۔

اس کی بیوی کو فوت ہوئے دو سال ہوئے تھے۔دِن میں وہ بازار کی مٹر گشت کو جا نکلتا تھا اور گھر میں کیبل پر چینل بدلتے، سگار اور کافی پیتے وقت گزارنا اُس کی عادت بن گئی تھی۔اخبار کا باریک بینی سے مطالعہ کرنا بھی اس کا مشغلہ تھا۔اس کے علاوہ اُس نے اور کوئی شوق نہیں پالا تھا۔

گھر میں بیٹا اور بہو تھے۔ دونوں سویرے سویرے اپنے کام پر نکل جاتے۔ شام ڈھلے لوٹتے۔ وہ عضوِ معطل کی مانند زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کبھی بیٹے اور بہو کے معاملات میں مداخلت نہیں کی تھی لیکن یہ فون پر اُترنے والی افتاد سے وہ پہلے پہل تو بہت گھبرایا، پھر اسے خیال آیا یہ بھی وقت گزاری کا اچھا مشغلہ ہے ایک خاتون کی بے مقصد باتیں سن لینے میں حرج ہی کیا ہے لیکن وہ کہتی ہے میں نے ایک خط کتاب میں رکھا تھا۔ کیا سچ کہتی ہے؟ یہ بھی ممکن ہے وہ بچپن میں ہمارے گھر کسی تقریب میں آئی ہو، کوئی شادی بیاہ کا موقع ہو۔ یہ بھی امکان ہے وہ عورت سچ مچ دُکھی ہو۔ مجھے اس کی گفتگو سنجیدگی سے سمجھنا چاہیے۔ ممکن ہے واقعی وہ مجھ سے محبت کرتی ہو۔ شاید ثبوت مل جائے۔ مجھے اس کے ساتھ نرم لہجے میں بات کرنی چاہیے اسے اپنے اس خیال سے گھن آئی کہ اس خاتون سے باتیں کرنا وقت گزاری کا مشغلہ ہے!

(۲)

یہ ایک بازار ہے۔

سورج نکلنے سے پہلے خاکروب جھاڑو لگا کر بازار کی سڑک صاف کر گئے ہیں۔ ابھی بازار نیند سے نہیں جاگا۔ دُکانوں کے شٹر بند ہیں۔ دُکانوں کے سامنے ریڑھیوں پر کپڑے مڑھے ہیں۔ شام ڈھلنے پر جیسے پرندے گھونسلوں میں لوٹ جاتے ہیں ایسے ہی تھکے ہارے دُکان دار ریڑھی والے، مزدور سب گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ ریڑھی والے بچی کھچی سبزی، فروٹ اور دیگر اشیاء پر کپڑا باندھ کر جاتے ہیں۔

وہ صبح سویرے بازار آ نکلا تھا۔

ریڑھیاں خاموش پڑی تھیں۔ ایک ریڑھی اُلٹی دھری تھی۔ جوتوں کی دُکان کے سامنے کھڑی ریڑھی کو اس نے ایک نظر دیکھا۔ ریڑھی والا ایک سفید ریش شخص ہے اس کی آٹھ بیٹیاں

ہیں جو کنواری بیٹھی ہیں۔ بازار کے اِس سرے سے اُس سرے تک چیتھڑوں میں ملبوس جو شخص سارا دِن ہاتھ میں پتھر اُٹھائے گھومتا ہے اس کے گھر بھی بھوک پکتی ہے۔ یہ اس روز پاگل ہوا تھا جس روز زکوۃ دینے والوں نے اس کی بیٹی کا جسم اپنی آنکھوں سے ٹٹولا تھا۔ شام ڈھلے کھڑاک کھڑاک کی آواز سے دُکانوں کے شٹر گرتے ہیں۔ ریڑھیاں چپ ہو جاتی ہیں۔ پاگل ایک دُکان کے تھڑے پر جسم سمیٹ کر سو جاتا ہے۔ روز بازار جانا اس کے معمولات کا حصہ ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ شخص ہے کیا کرے کبھی وہ آٹے والی چکّی پر وقت کو دھکا دینے کی کوشش کرتا ہے کبھی گول گپّے والے کا ایک گول گپا اُٹھا کر منہ میں ڈال لیتا ہے۔ گول گپّے والا بھی بابے سے بے تکلف ہے۔ بازار کے بارے میں سوچنا اس کی سائیکی کا حصہ ہے۔ صبح دم بازار انگڑائی لے کر جاگتا ہے۔ اِنسان رزق کی تلاش میں نکلتا ہے۔ سارا دِن ریڑھیوں پر دُکھ بِکتے ہیں۔ دُکھ بیچنے والے اتنا نہیں کما پاتے کہ سُکھ خرید سکیں۔

وہ ایک ریڑھی کے پاس رُک گیا۔ ریڑھی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لکڑی چیخ چکی تھی۔ کیل زنگ آلود ہو چکے تھے۔ ٹائر جانے کب کے گل چکے تھے۔ ایک مڑے تڑے پہیے کی جگہ اینٹیں جما کر اسے سہارا دیا گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا میں بازار سے روزانہ گزرتا ہوں۔ اس ریڑھی میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ میں رُک کر اسے دیکھ رہا ہوں یا شاید بازار جاگنے پر ہم توجہ نہیں دے پاتے۔ عمر بھر بازار سے گزرتے رہتے ہیں اگر میں بھول نہیں رہا تو اس پر ایک خشخشی ڈاڑھی والا بابا سبزی بیچتا تھا۔ شاید وہ گزر گیا اور اب اس کا بیٹا بیٹھتا ہے لیکن ریڑھی کے ساتھ تو میری کوئی یاد وابستہ نہیں۔ وہ خاتون یقیناً نفسیاتی مریضہ ہے وہ مجھے بھی پاگل کر دے گی۔ عمر کے اس حصے میں اس کے ساتھ ملاقات بھی ممکن نہیں۔ لٹکتی جلد جھریوں بھرے چہرے کے ساتھ کیا اچھا لگوں گا لیکن وہ کیوں کہتی ہے میں صرف تمہاری ہوں یہ جملہ کس نے ادا کیا۔۔۔؟

نہیں نہیں کسی نے بھی نہیں کہا۔ یہ میرا وہم ہوسکتا ہے ابھی جو میرے من میں مکالماتی جنگ ہو رہی ہے کہیں یہ واہمہ تو نہیں۔ واہمہ۔۔۔؟ کوئی آواز، خوشبو، جھونکا! بالکل نہیں لیکن یہ آہٹ کس کی ہے کون ہے جو دبے قدموں میرے دِل میں چہل قدمی کر رہا ہے۔ میں اسے پہچان کیوں نہیں پا رہا اگر یہ واقعی میری ہے تو اس نے کب کہاں اعتراف کیا تھا؟ میں ریڑھی کے پاس کیوں رُکا ہوں؟ یہ وہی ریڑھی تو نہیں۔ اس نے ایک بار پھر ریڑھی کو غور سے دیکھا۔ بازار میں سبزی اور فروٹ کی بولی لگنے سے بیشتر انہیں ڈھیریوں کی شکل میں سجایا جا رہا تھا۔ مختلف اشخاص تھڑوں اور اُن ڈھیریوں کے درمیان ہاتھ لہرا لہرا کر بولیاں الاپ رہے تھے۔ اسے اپنے اندر چند روز قبل کے فون کی آواز سنائی دی۔ بازگشت اس کی سماعتوں سے ٹکراتی اسے پریشان کیے دے رہی تھی۔ اس نے یہ کیوں کہا۔۔۔ وہ ریڑھی کا ذکر کر رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا ایک بار میں سبزی خریدنے گئی تھی۔ کب گئی تھی؟ اُفوہ۔۔۔ یہ تو مجھے اس سے معلوم کرنا یاد ہی نہ رہا۔ ہاں سبزی خریدنے گئی تھی۔ ریڑھی کا ایک کیل سبزی لے کر پلٹتے ہوئے اس کے دوپٹے میں اٹکا۔ وہ کہتی ہے اس لمحے میں سامنے والے جنرل اسٹور میں کھڑا تھا۔ جانے یہ کتنے سال پہلے کی بات؟ کیسے ادا سے کہہ رہی تھی ''مجھے یوں محسوس ہوا تم نے میرا آنچل پکڑا ہے۔ میں پلٹی تو کم بخت کیل تھا۔ کیل بھی مجھے تمہاری طرح نہیں بھولا کیونکہ تم جو جنرل اسٹور میں کھڑے تھے۔'' عجیب و غریب خاتون ہے جانے اس کی عمر کیا ہے؟ کہیں بے وقوف نہ بنا رہی ہو۔۔۔؟ ملاقات کا نہیں مانتی۔ مل بھی لے تو کیا حرج ہے میں نے اس عمر میں کون سا تیر مار لینا ہے۔۔۔ ہوں ہوں ں۔۔۔ ں۔۔۔ اس نے بے خیالی میں سر ہلایا۔ اسے کسی نے خبر دی ہوگی مرد تو ّے سال میں بھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ اب فون آیا تو کھری کھری بات کروں گا۔ مجھے تو فون کرنے کی اجازت بھی نہیں۔ سختی سے منع کر دیتی ہے اُوپر سے رعب جھاڑتی ہے۔۔۔ تم نے فون کیا تو میں تمہیں کبھی فون نہیں کروں گی کیسی اُلجھن میں ڈال دیا ہے مجھے اس پیری میں! خط کا ذکر ہر بار دُہراتی ہے۔ پرانے ٹین کے بکسوں میں کتابیں رکھوائی تو تھیں میں نے۔۔۔ بیٹے سے کہتا ہوں اسٹور سے بکسے نکال دے شاید نکل آئے۔ کہا تو بہو سے بھی جا سکتا ہے وہ بھی بھلی مانس ہے۔۔۔ بازار کی مشرقی نکڑ پر گول گپّے والا صدا لگا رہا تھا۔۔۔ کرارے

کرارے مزیدار گول گپے۔۔۔وہاں سے گزرتے ہوئے اس نے ایک گول گپا منہ میں ڈالا اور خط کی تلاش کا آخری فیصلہ کر کے گھر کو چل دیا۔۔۔

(۳)

''بابا۔۔۔ٹرنک تو کہیں اسٹور میں رکھوائے تھے۔کیا ضرورت پیش آ گئی۔''

''بیٹا۔۔۔اس میں پرانی تصویروں کے البم میری کچھ ڈائریاں اور دوستوں رشتہ داروں کے خطوط ہیں۔پرانی یادیں تازہ کرنے کو جی کرتا ہے۔نوکر سے کہہ کر نکلوا دینا۔''

''اچھا بابا۔۔۔کل صبح اتوار ہے۔میں بھی گھر پر ہوں۔ٹرنک نکلوا دوں گا۔''

دِن خوب چڑھ آیا تھا۔نوکر جانے کہاں مر گیا تھا خود اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اسٹور کے کاٹھ کباڑ سے ٹرنک نکالتا۔کہیں دوپہر میں دو ٹرنک اس کے بیٹے نے نکلوا کر کمرے میں رکھوا دیے۔

رات ٹیلی ویژن پر خبر نامہ دیکھنے کے بعد اس نے کمرے کی کُنڈی چڑھائی۔ٹرنک کھولا کتابیں، البم، خطوط گرد آلود فائلیں! اس نے پہلے کتابوں کو ورق ورق کھولا۔ٹرنک خالی ہو گیا لیکن اُسے وہ خط نہیں ملا جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا۔کمر سیدھی کرنے کو اس نے دیوار سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔

یہ مجھے کیا ہو گیا ہے وہ عورت کیوں میرے حواس پر چھا گئی۔میرا اس سے کوئی ناتا نہیں جڑتا کوئی رشتہ نہیں نکلتا۔کیسی پُرسکون زندگی گزار رہا تھا میں، بازار جانا، اخبار پڑھنا، کیبل دیکھنا، گھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹا لینا۔اب ہر وقت اس کے خیالوں میں کھویا رہتا ہوں۔دن کا چین، رات کی نیند گئی۔اب کے فون آیا تو میں کھل کے بات کروں گا۔وہ خیالوں کے تانے بانے بُننے میں مصروف تھا۔اسے دوسرا ٹرنک کھولنے کا خیال آیا۔ٹرنک کھول کر وہ بڑبڑا اپنی مرحومہ بیوی

کی چیزیں دیکھ رہا تھا۔ اس ٹرنک میں سے بھی کوئی کتاب برآمد نہ ہوئی۔ دونوں ٹرنک ماضی کی یادوں سے اٹے پڑے تھے۔ یادوں پر سے اس نے گرد صاف کی رات گئے تک وہ ماضی کے دھندلکوں میں سے ایک چہرہ تلاش کرتا رہا لیکن کوئی یاد کی کترن ایسی نہ نکلی جس سے وہ مکمل شبیہہ اُبھار لیتا۔ صبح فون پر اس نے خاتون کو خبر دی تھی کہ آج اسٹور سے ٹرنک نکلوا کر میں خط تلاش کروں گا۔

فون کی گھنٹی بجی۔

وہ چونکا رات گئے کس کا فون ہے۔ شاید اُسی کا ہو، اُمید لگائے بیٹھی ہو کہ خط کی بازیافت سے وہ اپنی محبت ثابت کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔۔۔!

''ہیلو۔۔۔ٹرنک میں سے کچھ نکلا۔''

''ہاں مِل گیا۔۔۔''

''کیا خط مِل گیا۔۔۔؟''

''نہیں خاتون مجھے میرا ماضی مِل گیا۔''

''چلو اس ٹرنک میں نہ سہی تم دل کا ٹرنک کھول کر دیکھو۔ وہاں تو خط موجود ہوگا ہی۔''

''خاتون میں آپ کو ایک مشورہ دوں۔''

''سر آنکھوں پر۔۔۔دیجیے۔''

''اب یہ کھیل بند کیجیے۔ میرے اعصاب چٹخ گئے ہیں۔ آپ واقعی اوائل عمر میں میرے گھر میں آئی تھیں۔ کسی کتاب میں خط رکھا تھا جنرل اسٹور میں کھڑے دیکھا تھا مجھ کو اور۔۔۔ اور۔۔۔ مجھے فراموش کرنے کے لیے چار پانچ عشق فرمائے تھے آپ نے۔۔۔! ساری باتیں درست لیکن مجھے اس اُلجھن سے نکالیے۔ میں آپ سے کیا کہوں میری سماعت آپ کی آواز کی

عادی ہوگئی ہے۔جس روز آپ کا فون نہ آئے میں کوئی کام نہیں کر پاتا لیکن اتنا عرصہ گزرنے پر بھی آپ کی ذات ایک معمّہ ہے جسے میں حل نہیں کر سکا۔"

"کیا تمہیں میرے فون سے خوشی ہوتی ہے۔"

"اس میں شک ہے کیا۔۔۔؟"

"تمہاری سماعت میری آواز سے اس درجہ مانوس ہوگئی کہ تمہیں میری کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے۔"

"لیکن خاتون۔۔۔؟"

"صبر کا دامن کیوں چھلکنے لگا ٹھہرو! آج تمہاری اُلجھن دُور کیے دیتی ہوں۔"

"میں مڈل پاس متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔شادی کی عمر نکل چکی۔ میرا کوئی مشغلہ نہیں۔ہم معاشرتی جبر میں پسنے کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔گائے، بھینس، بکری کی طرح کسی کھونٹ باندھ دی جاتی ہیں۔ میں سارا دِن گھر برتن مانجھتے سوتیلی ماں کے سر سے جوئیں نکالتے جھڑکیاں سہتے گزار دیتی ہوں۔ مجھے بھی خوشی کی تلاش تھی۔اپنے اندر کی گھٹن کم کرنے کو میں نے رانگ نمبر ملایا۔ پہلے اپنے اندر ایک مکمل کہانی ترتیب دی پھر تمہارے ساتھ چل نکلی۔تم حیران ہوگے مڈل تعلیم اور اتنی باتونی کیسے ہوں۔ یہ اندر کی گھٹن کو راستہ ملا تو باتیں کرنے اور کہانیاں بننے کا ہنر بھی آ گیا۔ جب تم نے اپنی عمر بتائی تو میں پُرسکون ہوگئی یہ میری زندگی کا واحد رنگین مشغلہ تھا۔۔۔"

"تھا، سے کیا مراد ہے تمہاری۔"

"شاید میری ساری عمر کی ریاضت، صبر اور سوتیلی ماں کا جبر جو میں نے جھیلا اللہ میاں کو پسند آ گیا۔ایک رشتہ آیا ہے میرا یوں سمجھو، طے بھی ہوگیا۔"

"کون ہے وہ۔۔۔!"

''ایک رنڈوا ہے۔ کپڑے کی دُکان کرتا ہے۔ اسے اپنے بچے پالنے کے لیے ایک عورت چاہیے مجھے نہیں معلوم میں ایک جہنم سے دوسرے جہنم میں جارہی ہوں یا کوئی خوشی بھی میری منتظر ہے۔ تمہیں میں نے بہت تنگ کیا، ہو سکے تو مجھے معاف کردینا۔''

''تو۔۔۔ کیا اب کبھی فون نہیں کروگی۔''

''نہیں۔۔۔!''

فون بند ہوگیا۔ کمرے میں ہول ناک سناٹا تھا۔ اسے لگا وہ کوئی فلم دیکھ رہا تھا۔ وہیں ٹرنکوں کے پاس بیٹھے بیٹھے رات کے کسی حصے میں اُسے نیند آ گئی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کا ہر عضوِ جسم پھوڑے کی مانند درد میں مبتلا تھا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اعصاب جواب دے گئے۔

اسے یوں لگا اس کے جسم کا ہر عضو آج ریٹائر ہوگیا ہے۔

☆☆☆

شور بہت کرتا تھا

یہ ایک سادہ سی کہانی ہے، زمین کا دُکھ ہے۔ دیارِ غیر میں سانس کے عذاب سے گزرنے والوں کا نوحہ ہے۔

ایک کبوتر، روشن خان، ریاست خان، ایک انجینئر، معصوم بچی، کویت کی سلیٹی سڑکیں، پاکستان سے آنے والا ایک موت کا ٹیلیفون، چند سوکھی روٹیاں اور کنارہ گیر گم نام شخص جو میرے افسانے کے کردار تھے۔ سب میرے ساتھ اب بھی ملاقات کو آ نکلتے ہیں۔ حیران، آنکھوں میں سوال لیے کہ میں نے انہیں کیوں فراموش کر دیا۔۔۔

بے روزگاری ہر دور میں دائر رہتی ہے۔ یہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسا وائرس ہے جو مظلوم، بے بس، غریب، مجبور اور بے بس انسانوں کی ہڈیوں کا گودا کھا جاتا ہے۔ ابھی تک

ایسی ویکسین ایجاد نہیں ہوئی جو اس بیماری کے جراثیم کا مکمل طور پر خاتمہ کر سکے۔

وہ درمیانی عمر کا ایک پختہ مرد تھا۔اس نے بے وطنی کو گھر مان لیا تھا اور سارا دن سڑکوں پر پتھر کوٹتا۔شام ڈھلے ایک بے جان پتھر کی مانند بستر پر آ رہتا۔وہ کویت کی مختلف پرائیویٹ کمپنیوں میں قسمت آزمارہا۔قسمت آزمائی میں ایک دن وہ بیلچے سے ایک ٹرنچ کی کھدائی میں مصروف تھا اسی دوران اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

''یار!۔۔۔تم مینا الزور چلے جاؤ وہاں تیل کی ایک کمپنی ہے وہ دیہاڑی مناسب دیتے ہیں۔''

''کیسے چلا جاؤں۔۔۔؟تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے مجھے وہاں بلایا گیا ہے۔''

''ہاں بلایا گیا ہے۔۔۔وہاں میرے چند دوست رہتے ہیں انہوں نے کہا ہے یہاں آجاؤ اور یہ بھی کہا ہے ایک آدھ دوست ساتھ لیتے آؤ تو وہ بھی کھپ جائے گا۔تم آج رات تیاری پکڑو۔''

''لیکن یار۔۔۔وہ تو پٹھان ہوں گے۔تمہیں تو سینے سے لگائیں گے لیکن میں۔۔۔؟''

''یارا۔۔۔پردیس میں کوئی پنجابی، پٹھان، بلوچی نہیں ہوتا۔سب پاکستانی ہوتے ہیں۔''

اگلی صبح وہ بس میں بیٹھے اور مینا الزور پہنچ گئے۔سورج کافی نکل آیا تھا۔جب وہ ڈیرے میں داخل ہوئے تو ایک دراز قد، گٹھے ہوئے مضبوط چوڑے چکلے شانوں والے پٹھان نے جس کے چیچک زدہ چہرے پر مسکراہٹ تھی ان کا استقبال کیا۔۔۔

''آؤ۔۔۔آؤ۔۔۔جی بسم اللہ۔۔۔ریاست خان نے کہا تھا آپ کا خاص خیال رکھنا ہے۔''

''ڈیرہ'' دو کمروں، باورچی خانے اور صحن میں ایک غسل خانے پر مشتمل تھا۔ بے وطن لوگوں کے لیے وہاں طرزِ زیست کٹھن تھا۔ رہایش گاہ المعروف ''ڈیرہ'' مرغی کے ڈربوں سے مماثل تھا۔ ایک ڈربے کا کرایہ سو دینار سے متجاوز ہونے کی وجہ سے انسان تو مرغیوں کی جون میں نہیں ڈھل سکتے تھے لیکن ایک ڈربے میں دس دس افراد اپنے میٹرس بچھا کر دس دینار میں مہینہ گزار جاتے ایسا کرنے سے وطن لوٹ کر پُرسہولت زندگی گزارنے کا خواب ان کی آنکھوں میں زندہ رہتا اور چشمِ تخیل میں وہ ڈربے کو محل دیکھتے۔ وہ مزدور بھی کسی ایسے ڈربے کا مکین تھا اور یہاں ''ڈیرہ'' دو کمروں، باورچی خانے اور صحن میں ایک غسل خانے پر مشتمل تھا۔ کشادگی دیکھ کر اس نے ٹانگیں پھیلائیں اور جلد ہی خراٹے لینے لگا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ پھر سو گیا۔ سہ پہر کے بعد شور سے اس کی آنکھ کھلی۔ آنکھیں ملتے ہوئے اس نے دیکھا کمرہ افراد سے بھرا ہوا ہے۔ فوری طور پر سب کے نام یاد رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ روشن خان کے بعد دوسرا نام اسے ریاست خان کا ازبر ہوا۔ رات کھانے کے بعد ریاست خان نے اعلان کیا کہ مہمان کی تکریم میں سب مِل کر پختون ناچ ناچیں گے۔ روشن خان نے ٹیپ میں پشتو موسیقی کی کیسٹ ڈال دی اور سب ایک دائرے میں آگے کو جھکتے ہوئے تالی بجاتے اور پلٹ کر سر کے بال پیچھے جھٹکتے، ایک مخصوص آواز نکالتے جس سے رگوں میں لہو گرمی پکڑتا۔ وہ بہت دیر تک ہلا گُلا مچاتے اور خوش ہوتے رہے۔ نوکری مزدوری کے معاملات زیرِ بحث رہے باتوں باتوں میں وہ بازار کے لیے اٹھے تاکہ ناشتے کا سامان لے آئیں۔۔۔ ابھی وہ بڑی شاہراہ عبور کر کے ایک بغلی سڑک پر مڑے تھے کہ ایکا ایکی ان پر پتھروں کی بارش ہوگئی۔ روشن خان نے اسے کلائی سے پکڑ کر گھسیٹا اور قریبی بقالے میں گھس گیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا کہ ہوا کیا ہے۔۔۔؟

''کچھ نہیں ہوا، یارا گھبرا مت۔۔۔ ادھر ایسا ہوتا ہے بچہ لوگ شلوار قمیص والے کو دیکھ کر

پتھر مارتا ہے۔"

"لیکن یہ ہندی ہندی کیوں بولتا ہے۔۔۔؟"

"یہ پاکستانی ہندستانی سب کو ہندی سمجھتا ہے۔"

"کیوں سمجھتا ہے۔۔۔؟ پاکستانی پاکستانی ہے ہم نے اپنا الگ وطن لیا ہے۔"

"اوئے خانہ خرابہ ان عرب بدؤوں کو کون سمجھائے۔"

"یہ بچہ لوگ ہے چھوڑو۔۔۔اب نکلو۔"

"کہیں پھر پتھر نہ پڑیں۔"

"اب کچھ نہیں ہوگا۔۔۔تم اللہ کا نام لے کر نکلو۔۔۔یہ روز ہوتا ہے ہم عادی ہوگیا ہے۔"

"ویسے خان صاحب یہ پٹھان کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ مار کھائے یا کھانے کا عادی ہوجائے۔"

"اوئے خوچہ تو نہیں سمجھے گا۔۔۔یہ ہمارے نبی پاک ﷺ کی قوم ہے۔اس پر ہاتھ اُٹھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ہمارے نبی پاک ﷺ نے بھی پتھر کھائے تھے اور معاف کر دیا تھا۔"

وہ ایک دکان سے ناشتے کا سامان لے کر پلٹے تو رات کا ایک حصہ بیت چکا تھا۔صبح اس نے ان کے ساتھ مزدوری پر جانا تھا۔اس کا دن بہت خوبصورت گزرا تھا۔رات بستر پر لیٹے لیٹے وہ اپنے ویزے کی مدت کا حساب جوڑتا رہا۔اس نے فیصلہ کیا باقی مہینے ان لوگوں کے سنگ گزر جائیں تو آسانی رہے گی۔

وہ گہری نیند میں تھا۔

جب اسے جگایا گیا ناشتہ وہ سب مل کر چھوٹے سے صحن میں کر رہے تھے۔مغربی دیوار پر سے ایک کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرتا صحن میں اترا۔اسے روٹی ڈالی گئی۔اس کا رنگ خاکستری

تھا۔ناشتہ کر کے سب اپنے اپنے کام سے نکل گئے ریاست خان اسے بھی ساتھ لے گیا۔زندگی نے ڈگر باندھی اور وہ اپنے حصے کے کام پر روزانہ نکلتا اور ڈیرے پر لوٹ کران کا ہاتھ بٹانا اپنا فرض سمجھتا۔وہ اکثر شام ڈھلے کام سے واپس آتا،سورج ڈوبنے سے آدھ پون گھنٹہ قبل۔۔۔وہ جب ڈیرے میں داخل ہوتا اس کی پہلی نظر کبوتر پر پڑتی وہ صحن میں یا دیوار پر اسے ملتا۔دیارِغیر میں یہ بے زبان اس کے ساتھ اس درجہ مانوس ہو گیا کہ اس کے سامنے باجرہ پھیلاتے ہوئے وہ ڈھیروں باتیں کرتا اپنے دکھ سکھ اس کے ساتھ بانٹتا۔اس کی غٹرغوں غٹرغوں کی آواز سے اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس کی کتھا نہ صرف سمجھ رہا ہے بلکہ اپنے دکھ بھی سنا رہا ہے۔۔ایک روز اسے خیال آیا کہیں یہ بھی میری طرح بے وطن نہ ہو۔جانے کس دیس سے آیا ہے۔۔۔؟میں حضرت سلیمانؑ کے دور میں ہوتا تو پھر اس کا وطن معلوم کر لیتا۔

اس روز کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی۔موسم قدرے گرم تھا۔جب وہ گھر میں داخل ہوا کبوتر دیوار پر موجود نہیں تھا۔اس نے چائے کا کپ بنایا۔کمرے میں ایسے زاویے پر بیٹھ کر چائے پینے لگا کہ کبوتر اگر آ نکلے تو اسے دیکھنے میں مشکل نہ ہو۔کمرے کے کونے میں چاندی کے پرانے کٹورے میں باجرہ رکھا تھا۔وہ چسکیاں لیتا رہا اخبار پڑھتے ہوئے اس کی نظریں دروازے سے گزر کر صحن میں بھٹکتی رہیں۔رات اُتر آئی لیکن کبوتر نہ اترا۔۔۔اگلے روز کام میں اس کا جی اچاٹ رہا۔لیکن یہ کوئی ایسی پریشانی نہیں تھی جو وہ کسی سے بانٹتا۔دن گزرا سہ پہر ڈھل گئی رات پھر اُتر آئی۔کبوتر جانے کس تاریکی میں اترا کہ اس کی کوئی خبر ہی نہ تھی وہ کٹورے میں رکھے باجرے اور صحن میں رکھے مٹی کے آبخورے کو دیکھتا تو اس کا دل کٹتا۔لیکن مشکل یہ تھی کہ کسی نے بھی کبوتر کی گمشدگی کا نوٹس نہیں لیا تھا۔وہ سوچتا رہا کہ میں اپنا دکھ بانٹوں تو کس کے ساتھ۔۔۔

اگلے روز۔۔۔وہ ڈیوٹی سے واپس آیا تو عجیب سناٹا تھا۔سارے صحن میں جمع تھے اور

خاموشی کانچ کے برتن کی طرح ان کے درمیان رکھی تھی۔ عجیب دکھ تھا جو ہر چہرے پر یکساں تھا۔ یا پردیس نے دکھ کو یکساں کر دکھایا تھا۔ انجینئر نصیر احمد جو مہینے میں ایک آدھ بار آ نکلتا تھا وہ بھی چپ اوڑھے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ صحن میں بچھی ہوئی دری نے موت پر مہر تو ثبت کر دی تھی۔۔۔ لیکن کون گزر گیا۔۔۔

''کیا میں خود تو نہیں گزر گیا۔۔۔؟''

''آؤ بیٹھو۔۔۔''

وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔۔۔

''ریاست خان کا جوان بھائی پشاور میں ایک گاڑی تلے کچلا گیا۔۔۔''

''ہیں۔۔۔ کب اطلاع آئی۔۔۔؟ ریاست خان کہاں ہے۔۔۔''

وہ یوں لرزا جیسے اس کے گھر سے میت اُٹھی ہے۔ پشاور کی ایک گلی سے ریاست خان کے بھائی کی موت نکلی اور سات سمندر پار کویت کے صحراؤں میں کُرلاتی سب کے انگ انگ میں اُتر گئی۔ سب اشک بار تھے۔ روشن خان جب ریاست کے سینے لگا تو سناٹے یوں کُرلائے کہ دیوار و در اشکوں سے ڈھل گئے۔

سب نے وضو کیا۔ غائبانہ نمازِ جنازہ کے لیے صفیں باندھیں۔

موت کا سناٹا کئی دن چھایا رہا۔۔۔

یادداشت کی آخری کرن جو ذہن میں کسی کسی لمحے چمک اٹھتی ہے۔ بھگویا ہوا باجرہ کٹورے میں سوکھ گیا تھا۔ ایک ہفتہ بعد مجھے روشن خان نے بتایا تھا کہ کبوتر شور بہت کرتا تھا۔

ایک دوپہر میں نے اسے باجرا ڈال کر پکڑا اور۔۔۔

اُس کی گردن مروڑ دی۔۔۔

کبوتر کی گردن کیوں مروڑ دی گئی؟

اُس کا قصور کیا تھا۔۔۔؟

صرف یہی کہ وہ شور بہت کرتا تھا۔۔۔!

☆☆☆

مکینک کہاں گیا

دل پر لگنے والی چوٹ گہری تھی، من میں اترنے والا گھاؤ شدید تھا۔اس کی آنکھیں جھکی تھیں۔ پاؤں کے انگوٹھے سے وہ زمین کریدر ہا تھا۔آنکھیں اٹھانا اس تربیت کے خلاف تھا جو اس کی طبیعت اور مزاج کا بچپن سے حصہ تھی۔ وہ آنکھیں اٹھا کر باپ کے سامنے گستاخی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔باپ اسے تھپڑ دے مارتا تو وہ سہہ جانا آسان تھا لیکن باپ کی آنکھ میں اترا غصہ اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر گیا۔اپنے وجود کے ریزے چن کر دوبارہ سانس بحال کر کے وہ کہیں نکل جانا چاہتا تھا لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔باپ کے غصے کو سہتے سہتے وہ جینا تو سیکھ گیا لیکن مجروح عزتِ نفس کی کرچیاں رات میں اس کے لیے باعث آزار ہو جاتیں وہ سونے کو بستر پر لیٹتا تو پورے بستر پر عزتِ نفس کی کرچیاں کانٹوں میں بدل جاتیں۔

اس نے کن انکھیوں سے ماں کو دیکھا۔ ماں کے چہرے پر راکھ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھ میں آنسو اُترے لیکن وہ ماں کے لیے ان کو پی گیا۔ اسے خبر تھی اس کے آنسو ماں کی پوری رات کی نیند چھین لیں گے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ماں کی نیند میں کوئی رخنہ پڑے۔ اسے باپ بھی بہت اچھا لگتا تھا لیکن؟ وہ سوچتا، قصور شاید کسی کا بھی نہیں نکلتا۔ لیکن یہ روز کی ڈانٹ کیوں میرا مقدر ہے؟ اس کے اندر بہت سے چہرے بسے ہوئے تھے۔ ان چہروں میں ایسے چہرے اسے بہت بھاتے جن پر مسکراہٹ کا موسم رہتا تھا۔ ایک چہرہ مسجد کے مولوی صاحب کا تھا۔ نورانی چہرے والے مولوی صاحب سے اسے محبت اور گہری عقیدت تھی۔ ان کے لہجے کی ملائمت اسے کئی دن شانت رکھتی، دھیما لہجہ، بردباری، تحمل، اندازِ گفتگو میں ٹھہراؤ۔ وہ سوچتا میرا باپ ایسا کیوں نہیں؟ اسے جمعہ کا وہ خطبہ یاد تھا جو اس کے وجود میں تحلیل ہو گیا۔ مولوی صاحب نے زور دے کر سمجھایا تھا کہ والدین کے سامنے اولاد کی آواز پست رہنا چاہیے۔ اف تک کی ممانعت بھی اس کے ذہن میں محفوظ تھی۔ وہ کالج سے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں ہی ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ وہ آدھا ادھورا گھر میں سہما ہوا داخل ہوتا۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی سماعت پر انگارے برسنے لگتے۔

''یہ نالائق ہے پرلے درجے کا، غبی، کند ذہن، اس کی کھوپڑی میں بھس بھرا ہے، اس نے میرے خواب مٹی میں ملا دیے ہیں۔''

''دھیرے بولیں۔۔۔ہمسائے؟''

''تو بک بک نہ کر، زبان کھینچ لوں گا تیری۔''

اس کی ماں سہم گئی۔

''بابا۔۔۔وہ۔۔۔وہ۔۔۔بات یہ ہے!''

''مت بھونک۔''

''آج تو آپ ہتھے سے اُکھڑ گئے ہیں۔اس معصوم کی بات تو کم از کم سن لیں۔''

''بک جو بکنا ہے۔''

''بابا۔۔۔میں جو پڑھتا ہوں وہ یاد نہیں رہتا۔''

''دل لگا کر پڑھے تو یاد رہے نا۔اختر صاحب کے بیٹے کا داخلہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں ہوگیا۔وہ اپنے رحیم صاحب کی بیٹی تیری کلاس فیلو تھی وہ نشتر میڈیکل کالج ملتان میں پہنچ گئی ،فیاض صاحب کا بیٹا انجینئرنگ میں چلا گیا اور تو۔۔۔تو۔۔۔دفعہ ہو جا میرے گھر سے۔۔۔!''

وہ آنسو جو اس نے ماں کی نیند کے ڈر سے روک رکھے تھے۔دہلیز سے نکلا تو مٹی نے چُن لیے وہ مسجد گیا مولوی صاحب نہیں تھے۔اسے یہ یاد نہیں تھا وقت کون سا ہے۔اس نے وضو کیا دو نفل پڑھے مسجد کے صحن میں اکڑوں بیٹھا سوچتا رہا میں بابا کو کیسے سمجھاؤں مجھے واقعی سبق یاد نہیں ہوتا رات گئے تک جاگ کر میں نے امتحان کی تیاری کی۔مجھے تو پاس ہونے کی بھی امید نہیں تھی۔یہ اللہ کا کرم ہے میں ایف ایس سی تھرڈ ڈویژن میں پاس تو کر گیا۔

''میں بابا کے دکھ کیسے کم کروں؟''

میرا باپ خواب کیوں دیکھتا ہے۔ اس اُوپر والے نے سب کو ایک جیسا پیدا نہیں کیا۔قابلیت بھی ایک جیسی عطا نہیں کی۔رزق کی تقسیم بھی اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔شام تک ماں مجھے گھر واپس بلوا تو لے گی لیکن اب اس وقت میں کیا کروں۔کہاں جاؤں؟

نماز مغرب کے بعد اس نے مولوی صاحب کو اپنی کتھا من وعن سنائی۔مولوی صاحب اس کی باتیں انہماک سے سنتے رہے۔۔۔

''بیٹا۔۔۔تمہیں کوئی ہنر سیکھنے کا شوق ہے؟''

''جی۔۔۔''

''الیکٹرانک۔''

''کسی دکان پر بات کروں؟''

''میرا ایک دوست ہے جی، میں اس کی دکان پر بیٹھ سکتا ہوں۔''

''تم کل سے دکان پر بیٹھنا شروع کر دو لیکن کام میں لگن، دِل جمعی لازمی شرط ہے۔

اللہ کریم ہے۔''

''لیکن مولوی صاحب۔۔۔بابا۔۔۔؟''

''تمہارے بابا کو میں سنبھال لوں گا۔''

(۲)

سورج ان کوارٹروں سے کنی کترا کے گزرتا تھا۔سردیوں میں دھوپ کی قلت ہونے سے ان کوارٹروں کے مکین گلی میں نکل بیٹھتے۔مرد ڈیوٹی پر جاتے تو عورتیں گھر کے کام نمٹا کر کشادہ گلی میں چار پائیاں ڈال کر بیٹھ جاتیں اور کچر کچر باتیں کرتیں، سبزی کاٹتیں،کوئی نومولود کو دودھ پلانے کے لیے گود میں لیتی تو دوسری اسے یہ سمجھانا نہ بھولتی کہ دوپٹہ ٹھیک کرلو، یہ گلی ہے۔وہ نماز فجر کے بعد گھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹا کر نکل جاتا۔وہ کام لگن سے سیکھ رہا تھا،اس نے اپنے آپ کو پرزوں میں گم کر دیا،وہ ایک ایک چیز کے بارے پوچھتا۔۔۔

ایک روز دوپہر کے کھانے پر اس کے دوست نے کہا''یار!تمہارا شوق قابلِ رشک ہے۔''

''ہاں یار!میرا ایک تجربہ ہے۔۔۔''

''تمہیں آئے ہوئے کتنے روز ہوئے ہیں، تجربہ کیسا؟''

''یار! زندگی کے بارے بات کر رہا ہوں۔۔۔''

''یہ عمر اور تجربہ؟''

''تجربے کا عمر سے کیا تعلق؟ تجربہ عمر پر منحصر ہوتا تو سترہ سالہ محمد بن قاسم کی بجائے کسی بوڑھے جہاں دیدہ جرنیل کے سپرد فوجوں کی کمانڈ ہوتی۔ وقت سکھا دیتا ہے، وقت معلم ہے، کوئی لمحوں میں پالیتا ہے، کوئی عمریں رول کر بھی خالی رہتا ہے۔''

''یار! تم تقریر نہ جھاڑو تجربہ بتاؤ۔''

''تجربے کا تعلق چولہے سے ہے۔۔۔''

''انہی اُلٹی سیدھی سوچوں کی وجہ سے تمہاری ایف ایس سی میں تھرڈ ڈویژن آئی ہے۔ اب بولو بھی!''

''یار! میں نے اس زمین پر شعور کی آنکھ کھلنے پر جو منظر دیکھے اس میں ایک منظر بہت کرب ناک تھا اور وہ تھا اپنے حصے کا بوجھ ڈھونا۔ میں نے دیکھا ہے ہر انسان کو اپنے حصے کا بوجھ خود ڈھونا ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کا رتھ خود کھینچنا ہوتا ہے، کوئی کسی کے عمر بھر کام نہیں نبھا سکتا، انسان قلاش ہو تو کوئی صاحب ثروت دوست، رشتہ دار، دو چار بار تو مدد کر دے گا لیکن یہ جو روز کا چولہا ہے نا۔۔۔ یہ خود جلانا پڑتا ہے۔ ساری عمر کے لیے چولہے کا ایندھن کوئی فراہم نہیں کرتا۔ سبزی، گوشت، پیاز، دوائی، جوتی، کپڑا، دوا دارو، خوشی غمی کے اخراجات سب آدمی کو خود نبھانا ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی خوشی سے نبھائے یا بوجھ سمجھ کر گھسیٹے، گھسیٹنا خود ہی کو ہوگا۔''

''یار بات تو تیری دل کو لگتی ہے۔''

''اس لیے میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔''

''لیکن تیرے بابا کے خواب؟''

''زندگی خوابوں کے سہارے بسر نہیں ہوتی ہر آدمی اپنا مقدر لے کر پیدا ہوتا ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو تمہارا مقدر کیا ہے؟''

''مکینکی۔۔۔ مجھے یقین ہے میرے اللہ نے میری روزی اسی میں رکھی ہے۔''

''اگر کہو تو ساتھ والی دکان خالی ہو رہی ہے بات کروں۔''

''یار!۔۔۔ میں اکیلے دکان چلا لوں گا کیا؟''

''یار! ہمت پکڑو۔''

اس نے ہمت کی چادر کا کونا مضبوطی سے پکڑ لیا اور چند روز میں دکان سنبھال لی۔ اس کی ماں نے جو رقم بیٹی کی شادی کے لیے پس انداز کی تھی باپ سے چوری اسے پکڑائی اور وہ ٹولز اور دکان کا سامان خرید لایا۔

''بیٹا۔۔۔ کرایہ کتنا ہے دکان کا؟''

''ماں چار سو روپے۔۔۔!''

''اتنا نکل آئے گا کیا؟''

''ماں دُعا کرنا۔''

(۳)

''یہ ٹیلی ویژن ہے۔۔۔'' ایک شخص نے کندھے پر سے کپڑے میں لپٹا ٹیلی ویژن اس کی ورکنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جی اسے مرمّت کرنا ہے چلتے چلتے بند ہو گیا ہے۔ جانے کیا ہوا؟''

''کل تک لے جانا۔۔۔''

''ہمیں رات تک چاہیے۔''

''اور کام بھی دینا ہے جی۔۔۔!''

''کوشش کرو یار، ہم مزدور آدمی ہیں دن بھر مزدوری کرتے ہیں رات میں ایک آدھ فلم دیکھ کر سوتے ہیں یہی تو اپنا رونق میلہ ہے۔''

یہ اپنی نوعیت کا پہلا مشکل کام تھا، تین گھنٹے کی محنتِ شاقہ کے بعد اس نے فالٹ ڈھونڈ لیا، فالٹ دور کرنے کے بعد اس نے ٹی وی آن کیا تو اسے عجیب سی خوشی نے گھیر لیا، اسے لگا وہ ہوا میں اُڑ رہا ہے، اسے اپنے اندر اعتماد اور طمانیت اُترتی محسوس ہوئی۔

''یہ میں نے ٹھیک کیا ہے۔ کیا مجھے کام آ گیا ہے؟ میں اپنا کاروبار الگ سے چلا سکتا ہوں؟ میں نالائق نہیں ہوں۔۔۔ کُند ذہن اور غبی بھی نہیں، لیکن بابا مجھے ایسا کیوں کہتا ہے؟ بابا بے قصور ہے قصور معاشرے کا ہے، لوگ بابا سے کہتے ہوں گے تیرا بیٹا نالائق ہے، بابا تو سیدھا سادہ ہے آخر کس کا جی نہیں چاہتا کہ اس کی اولاد۔۔۔؟ وہ خوش تھا۔

مہینہ گزرنے پر اس نے حساب کیا دکان کا کرایہ، بجلی، کھانے اور چائے کا خرچہ نکال کر اسے ایک ہزار روپیہ بچ رہا۔ یہ اس کی اپنی محنت تھی، جب وہ گھر کو چلا اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے، وہ سوچتا رہا، یہ ہزار روپے ماں کے ہاتھ پر رکھوں، بابا کو دوں، مولوی صاحب نے میری تربیت کی ہے ان کا حق زیادہ ہے یا دوست جس نے مجھے ہنر دیا، اس نے ماں سے مشورہ کیا، ماں نے کہا رقم بابا کو دو وہ خوش ہوں گے۔

وہ جب سے دکان پر کام کرنے لگا تھا۔ اس کے باپ نے اسے ڈانٹنا کم کر دیا تھا، اسے وہ رات بھی یاد تھی جس میں اس کی ماں بابا کی پائینتی بیٹھی سمجھانے کے انداز میں کہہ رہی تھی ''اولاد جوان ہو جائے تو اسے مارا کرتے ہیں نہ بے جا ڈانٹا کرتے ہیں، اولاد کی بھی عزتِ نفس ہوتی ہے، وہ مجروح ہوتی ہے اولاد زچ ہو کر خودکشی کر لیتی ہے یا باغی ہو جاتی ہے۔ ہمارے بیٹے کی صحت کمزور ہے پھر بھی وہ دلجمعی سے کام سیکھ رہا ہے۔'' اس کی ماں تو پڑھے لکھے لوگوں جیسی باتیں کر رہی ہے۔

وہ جھجکتے ہوئے باپ کی کمرے میں داخل ہوا۔

''بابا۔۔۔''

اخبار سے نظریں اُٹھا کر اس نے بیٹے کو دیکھا۔

''کہو۔۔۔''

''بابا۔۔۔ یہ ہزار روپیہ۔''

''کہاں سے آیا ہے؟''

''بابا۔۔۔ میری اپنی محنت ہے۔''

(۴)

(کہانی بہت طویل ہے، سارے ٹکڑے جوڑے جائیں تو کہانی ناول میں ڈھل جائے گی، کسی بھی شخص کی عمر طبعی کو ناول، افسانے اور ڈرامے میں ڈھالنا بھی جانکاہی ہے، کہانی مکمل کرنے کے لیے ایک ایک ٹکڑا جوڑنا ضروری ہے، لباس میں پیوند لگے ہوں، تو بھی وہ لباس ہی کہلاتا ہے)

وہ ''کاویا'' پکڑے قلعی کی آمیزش سے ایک ریڈیو کے سرکٹ میں ٹانکا لگا رہا تھا کہ ایک آواز پر چونکا آواز کسی نے دکان کے باہر سے دی تھی۔

''میکینک''۔۔۔ پکارنے والا شخص کار میں بیٹھا تھا۔

وہ بادلِ ناخواستہ اُٹھ کر گیا۔

''ہمارا ٹی وی خراب ہے گھر چل کر دیکھنے کا کتنا لو گے؟''

''جی میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔''

''خوب خوب۔۔۔'' سفید کنپٹیوں والا شخص ہنسا۔

''سامان اُٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔''

اس نے شاپر میں اپنی ٹول کٹ ڈالی، ڈیجیٹل میٹر، پلاس، پیچ کس، قلعی کا ٹانکا لگانے کے لیے ''کاوِیا''۔۔۔!

گھر اتنی مسافت پر نہیں تھا، احمد ندیم قاسمی کے افسانے گھر سے گھر تک کا قالین کسی نے اس گھر میں لا بچھایا تھا وہ جوتیاں اُتارنے لگا تو اس شخص نے کہا۔

''یہاں یہ تکلفات نہیں چلتے۔''

''میکینک تمہاری چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے پہلے چائے پی لو۔'' کمرہ حُسن کی آواز سے جگمگا اُٹھا۔

اس نے انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے چائے پر سے بالائی کی تہہ ہٹائی اُسے پِرچ کے کونے پر جمایا اور ٹھنڈی چائے کا گھونٹ لیا۔

ٹی وی مرمت ہونے پر مزدوری کا پوچھا گیا۔

''پچاس روپے۔۔۔''

''صرف پچاس روپے'' لڑکی نے تحیر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔''

سفید کنپٹیوں والا شخص پھر ہنسا۔۔۔اس نے میکینک کو پانچ سو روپے پکڑائے، اس نے باقی رقم واپس کردی۔۔۔

''عجیب میکینک ہے؟''

وہ اس گھر کا فرد ہوگیا، پچاس روپے کی دیانت داری سے۔

زندگی اپنی رو میں بہتی رہی۔شام وسحر کے پیمانوں میں وہ اپنی عمر کے سانس پورے کرتا رہا، بازار میں اس کی دکان کو وقت کے ساتھ ساتھ مرکزی حیثیت حاصل ہوتی چلی گئی،

سفید کنپٹیوں والے شخص نے اسے جس نام سے منسوب کیا تھا، وہ اس کے نام کا سابقہ لاحقہ کی بجائے مکمل پہچان بن گیا۔

''اوئے چھوٹے بھاگ کے جا۔۔۔یہ چار چائے میکینک کی دکان پر دے آ۔۔۔''

''یار کمیٹی ڈالنی ہے تو پہلے اپنے میکینک یار کو بلاؤ۔۔۔''

''چھوڑ دیار۔۔۔انجمن ضرور بنانی ہے کیا؟ جو بنانا اتنا ہی ناگزیر ہے تو صدر میکینک کو چُن لو۔''

''وہ عزت کا سمبل بن گیا۔۔۔''

گھر پر جا کر مزدوری کرنے کو وہ اپنی زندگی کا حصہ نہ بنا سکا، لیکن سفید کنپٹیوں والے شخص کے ساتھ اس کی دوستی تعلق اس طور استوار ہوا کہ وہ فون آنے پر بھی ان کا کام نمٹا آتا، ایک دن وہ ان کے گھر سے Play Station کی Cleaning کا کام مکمل کر کے نکل رہا تھا کہ نقرئی آواز اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔۔۔

''میکینک تم بڑے مغرور ہو۔۔۔!''

''نہیں۔۔۔ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔''

''تم روبوٹ ہو کیا؟ ناک کی سیدھ میں آئے، کام کیا اور چلے گئے۔''

''انسان روبوٹ ہی تو بن کر رہ گیا ہے جی۔''

''لیکن جو پانچ سو روپے میں سے ساڑھے چار سو روپے لوٹا دے وہ روبوٹ نہیں ہو سکتا۔۔۔بیٹھو۔۔۔چائے پی کے جانا۔۔۔''

''دکان پر کام کارش چل رہا ہے۔۔۔''

''پندرہ منٹ میں چائے بن جائے گی، دو چار گاہک اور آ جائیں گے۔۔۔تمہارے رزق

میں اضافہ ہو جائے گا۔'' وہ وہیں لان میں بچھی کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔مالی پودوں کو پانی لگا رہا تھا، مالی نے پائپ ایک کیاری سے نکال کر دوسری میں ڈالا اور کھرپہ لے کر پودوں کی گوڈی کرنے لگا۔۔۔

''یہ سب لوگ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔۔۔'' میکینک نے مالی کو دیکھ کر کہا۔۔۔

''کیسے لوگ۔۔۔؟ کون سے۔۔۔؟''

''یہ جو اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے ہیں۔۔۔''

''اس میں تو شک نہیں۔۔۔''

''میکینک تمہیں معلوم ہے آج میں نے تمہیں کیوں روکا ہے۔۔۔؟''

''کمپیوٹر میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہو گا۔''

''نہیں تو۔۔۔''

''آج تمہارا مسئلہ ہے۔۔۔''

''میں سمجھا نہیں۔۔۔!''

''میکینک یہ بتاؤ تم ایک عرصے سے ہمارے گھر آ رہے ہو۔۔۔''

''جی۔۔۔''

''پچھلے ایک دو ماہ سے میں نے ایک بات نوٹ کی ہے، اس کی جستجو نے تمہیں روکنے پر مجبور کیا ہے۔'' ایک گہرا سناٹا تھا جو لان میں پھیل گیا، عجیب سی چپ تھی جو پودوں کے پتوں پر گرد کی مانند جمی تھی، فضا میں پرندے اڑان بھول گئے تھے یا اس کی نگاہیں ساکت تھیں، لڑکی کے چہرے پر محبت کا کوئی پرتو نہیں تھا لیکن ایک فکرمندی تھی جو اس کی آنکھوں سے جھلکتی تھی، جھلکتی فکر مندی نے اسے بھی متفکر کر دیا، یہ میرے بارے کیا سوچ رہی ہے، مان لیا میں مدت مدید سے

یہاں آ جا رہا ہوں، مجھے اس گھر کے دیوار و دَر سے اُنس ہے، ہر اینٹ مجھ سے مانوس ہو چلی ہے لیکن اتنی اہمیت۔۔۔؟ اور وہ بھی بازار میں بیٹھے ایک میکینک کو۔۔۔! اس لڑکی نے اتنی تمہید کیوں باندھی ہے۔۔۔بات کہنے میں اتنی دیر کیوں کر دی جاتی ہے؟ سانسیں اپنی رفتار بھول جاتی ہیں۔۔۔

''میکینک میری بات سن رہے ہو۔۔۔نا''

(نوکرانی چائے رکھ گئی)

''جی۔۔۔''

''میں دیکھ رہی ہوں تمہارے چہرے کا رنگ زرد ہو چلا ہے، تمہیں کیا روگ ہے؟''

''روگ تو کوئی نہیں۔۔۔''

''گردوں میں درد رہنے لگا ہے۔۔۔''

''مکمل چیک کرایا۔۔۔؟ مثلاً الٹرا ساؤنڈ وغیرہ''

''نہیں جی۔۔۔''

''میں نے پاپا سے کہا ہے۔۔۔تمہیں کل صبح۔۔۔!'' ابھی بات اس کے منہ میں تھی کہ سفید کنپٹیوں والا شخص لان میں داخل ہوا اور ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔۔۔

''تو۔۔۔پاپا میں اس سے کہہ رہی تھی کل صبح یہ آ جائے آپ اس کا مکمل چیک اپ کرا دیں۔۔۔''

''کیوں نہیں کیوں نہیں۔۔۔میکینک تم صبح خالی پیٹ آ جانا۔۔۔تاکہ جو Fasting Test ہوتے ہیں ان میں پریشانی نہ ہو۔''

''جی۔۔۔ایسی کوئی بات نہیں میں دوائی لے رہا ہوں آپ کا بہت بہت شکریہ۔۔۔

گردے کا معمولی درد ہے آرام آ جائے گا۔۔۔!''

''میکینک۔۔۔بڑوں کا کہا مانتے ہیں۔۔۔بس یہ آخری فیصلہ ہے تم صبح آ رہے ہو۔''

(۵)

ہسپتال میں جمگھٹا تھا۔۔۔

یہ چیک اپ کے چند ہفتوں بعد کی بات ہے۔۔۔وہ دکان میں کام کرنے میں مگن تھا کہ گردوں میں درد کی ٹیسیں شدید تر ہونے لگیں، کپڑے کی دکان والے بزرگ نے دکان کا شٹر گرایا، اپنی گاڑی نکالی، شوا سٹور والے نے اپنے بیٹے کو دکان سنبھالنے کو کہا اور کار کی پہلی سیٹ پر بیٹھ گیا، حُسنِ اتفاق ہے مولوی صاحب باربر شاپ میں بال ترشوا رہے تھے۔۔۔کہ ایک لڑکے نے کہا۔۔۔

''استاد جی۔۔۔اپنے میکینک کو بڑا شدید درد اٹھا ہے اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔''

مولوی صاحب نے باربر کا ہاتھ روک لیا۔۔۔اور دکان سے اٹھ آئے۔۔۔سوزِ دروں رکھنے والے سارے اس کے ساتھ ہو لیے۔۔۔کسی نے گھر اطلاع کی اس کا بوڑھا باپ۔۔۔ماں اور بھائی پہنچ گئے۔۔۔اسے ہسپتال داخل کر لیا گیا۔۔۔

اسے بستر پر لیٹنے سے الجھن ہونے لگی یہ اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھا، لیکن علاج ضروری تھا۔۔۔سب اس کے اردگرد موجود رہے، بچپن کے دوست، مولوی صاحب، دکان دار، سفید کنپٹیوں والا، ماں باپ۔۔۔ان سب کے درمیان موت بھی کہیں درمیان میں ہی گھوم رہی تھی کوئی بھی اسے نہ دیکھ سکا۔

موت گھومتی رہی۔۔۔!

ہسپتال کی کھڑکیوں کے شیشوں سے چھن چھن اندر آتی موت۔۔۔ہسپتال کے مین گیٹ

تک جاتی پلٹتی موت، اس کے بستر پر بیٹھی اس سے سرگوشیاں کرتی موت۔۔۔موت جوازل سے ہماری رفیق ہے، کسی کو نظر نہیں آتی، موجود رہتی ہے، اس لمحے جس لمحے ہم پہلا سانس لیتے ہیں، انسان جنم لیتا ہے۔۔۔انسان کے ساتھ موت جنم لیتی ہے۔۔۔موت کو بینائی نہیں پا سکتی، وہ سانس کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، میکینک کے ساتھ بھی وہ چل رہی تھی، اسے معلوم نہیں تھا، کسی کو معلوم نہیں ہوتا، وقت متّعین ہے پھر بھی معلوم نہیں۔۔۔میکینک کے والد کو بھی معلوم نہیں تھا۔۔۔موت وہاں ہسپتال میں تھی یا نہیں۔۔۔کسی کو معلوم نہیں تھا۔۔۔

جس صبح سورج کی کرنوں سے موت دبے پاؤں اُتری میکینک کے بستر پر مسکراہٹ تھی۔۔۔خبر اس وقت ہوئی جب شٹر گرے اور چھوٹے سے بازار کی سب دکانیں بند ہو گئیں۔

(آخری منظر)

سورج اب بھی کوارٹروں کی اس قطار سے کنّی کترا کے گزرتا ہے، سردیوں میں دھوپ کی قلّت ہونے سے ان کوارٹروں کے مکین گلی میں نکل بیٹھتے ہیں۔ مرد ڈیوٹی پر جاتے ہیں تو عورتیں گھر کا کام نمٹا کر کشادہ گلی میں چارپائیاں ڈال کر بیٹھ جاتی ہیں اور کچر کچر باتیں کرتی ہیں۔۔۔

ان میں ایک کردار کا اضافہ ہو گیا ہے۔۔۔!

ایک بوڑھا شخص ٹوٹی چارپائی دروازے کے سامنے ڈالے ہر آنے جانے والے سے سوال کرتا ہے۔۔۔

''اے بھائی۔۔۔اے بابا۔۔۔بیٹا۔۔۔او بیٹا۔۔۔بی بی۔۔۔میری بات تو سنو۔''

''میکینک کہاں گیا۔۔۔!''

☆☆☆

لالٹین جلتی رہے

اس کی بیوی لالٹین میں مٹی کا تیل ڈال رہی تھی۔ساتھ ساتھ بجلی کے محکمے کو بھی کوس رہی تھی۔خاک ترقی ہوئی ہے بادل گرجتے برستے بعد میں ہیں ذرا سی ہوا چلی اور بجلی گئی۔عمر گزر گئی روگ نہ گزرے۔لالٹین بھی ایک مسئلہ ہے چمنی صاف کرو ماچس ڈھونڈ کر ساتھ رکھو۔۔۔کیا مصیبت ہے۔اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بہتر ہے ابھی بندوبست کر کے رکھ لوں،اس نے ماچس چھنکا کر تسلی کی کہ ڈبیا میں کتنی تیلیاں ہیں۔۔۔؟ بادل زور سے کڑکا بجلی چمکی اور ساتھ ہی بجلی چلی گئی۔

''نگوڑی جانے کب آئے گی۔''اس نے دیا سلائی جلائی لالٹین کو روشن کیا اتنے میں اس کا

خاوند کھانستا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

''بڑے گہرے بادل ہیں اللہ خیر کرے۔۔۔''

''روٹی ابھی کھاؤ گے یا بجلی کا انتظار کرو گے۔''

''بجلی جانے کب آئے زوروں کی بھوک لگی ہے نیک بخت روٹی لے آ۔۔۔!''

اس نے خاوند کے سامنے روٹی پروسی۔نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔۔۔

''بچے اپنے اپنے گھروں کے ہوگئے تنہائی کتنی بڑھ گئی ہے۔''

''تنہائی تو انسان کا مقدر ہے۔''

''ہاں ٹھیک کہتی ہے۔زمین پر گنے چُنے سال ہیں۔سوچتا ہوں مرنے کے بعد صدیوں تنہائی کاٹنی ہے۔''

میرے خیال میں ہارن کی آواز ہے۔

کوئی گاڑی گزری ہوگی۔

رِم جھم شروع ہوچکی تھی۔دروازے پر دستک ہوئی۔کھانا چھوڑ کر وہ دروازے پر گیا واپس اندر داخل ہوتے ہوئے اس کا چہرہ خوشی سے گلنار تھا۔

''خوش بخت۔۔۔دیکھ اللہ نے تنہائی کاٹنے کا سامان کردیا ہے۔مہمان آگئے ہیں۔اللہ کی رحمت اتری ہے۔دیکھو تو کون آیا ہے۔۔۔؟''

وہ آگے بڑھ کر سب سے ملی۔برسوں میں شاید وہ پہلی بار آئے تھے یا وہ آئے ہوں اور انہیں یاد نہ ہو۔کیا واقعی مہمان آئے ہیں۔۔۔؟ کیا ایسے تو نہیں مصروفیات کی چکا چوند میں ہمیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ مہمان آئے ہیں۔لالٹین کے عہد میں تو رشتہ دار ایک دوسرے کے گھروں میں مہینوں قیام کیا کرتے تھے۔یہ ہم غریبوں کے گھر کی راہ کیسے بھول گئے۔ہم سے تو انہیں کوئی

مطلب، غرض اور کام بھی نہیں ہو سکتا پھر ان کا آنا۔۔۔؟ یہ راہ بھول گئے ہیں اتنے چھوٹے سے گھر میں ایسے مہمان تو نہیں اُترا کرتے۔

''اری خوش بخت۔۔۔مہمانوں کو بٹھا۔۔۔کن خیالوں میں گم ہے۔''

''پہلے یقین تو آ لینے دو۔۔۔''

اس نے بچوں کو پیار کیا۔سر پر بوسہ دیا اور باورچی خانے کی راہ لی۔کمرہ مہمانوں کی خوشبو سے بھر گیا۔۔۔

''بیٹا۔۔۔کیسے راہ بھول گئے یقین ہی نہیں آ رہا۔''

''بہت سالوں سے دل مچلتا تھا چچا لیکن ہم نے اپنے اردگرد جو یہ آسائشوں کے حصول کی دیواریں اٹھا رکھی ہیں انہوں نے اتنا الجھا دیا ہے کہ بس مت پوچھیے۔۔۔کاروبار بہت پھیل گیا اور مزے کی بات یہ ہے کہ کاروبار کے ساتھ ساتھ بیماریاں بھی پھیل گئی ہیں۔آپ کی یاد ہمیشہ آتی ہے۔۔یہ میری نالائقی ہے اور بس اسے کیا نام دوں۔۔۔''

لالٹین کی روشنی میں اس نے پریشر کُکر میں سالن پکانے کو رکھا۔توے پر سے گرم گرم چپاتیاں اُتاریں۔ان کے آنے سے گھر میں ایک دم بہار آ گئی تھی۔قہقہے بٹنے لگے تھے۔اس کا بھتیجا برسوں بعد راہ بھولا تھا۔بہو بڑی سندر، من موہنی، دلکش، ہنس مکھ، ملنسار اور خوش اخلاق تھی۔۔۔

''خالہ۔۔۔ان کو میں ساتھ لائی ہوں اس سے پہلے کہ یہ اپنے نمبر بنائیں۔انہیں ساری عمر نمبر بنانے کا شوق رہا ہے۔انہیں تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی۔''

''بیٹا۔۔۔ہر طرح سے خیریت ہے نا۔۔۔اِدھر اُدھر سے ہم خاندانی مسائل کا سنتے رہتے ہیں۔کوئی پریشانی تو نہیں ہے نا۔۔۔!''

''چچا۔۔۔آپ کے گھر آ گئے ہیں سکون آ گیا ہے اب کوئی پریشانی نہیں۔''

''بجلی آنے پر بچے اپنی دنیا میں مگن ہو گئے۔کیبل، ویڈیو گیمز، انٹرنیٹ۔۔۔!''

کمرے میں وہ چار رہ گئے رات ان کے درمیان تھی لالٹین جلتی رہنے دی گئی۔مہمانوں کے پاس ایک پوٹلی تھی جس میں دکھ، رنجشیں، مسائل، رویے، غلط فہمیاں اور درد بندھے تھے۔یہ شہر کی سوغات نہیں بلکہ خاندانی رویوں کی گٹھڑی تھی۔مہمان جو اس گھر میں اترے تھے وہ اس گٹھڑی کو برسوں سے سر پر اُٹھائے پھر رہے تھے اب یہ اتنی وزنی ہو چلی تھی کہ ان کی گردن کے مُہرے سوجن پکڑنے لگے تھے۔

بات کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

سگریٹ کا دھواں تھا، وہ تھے، رات تھی، چائے تھی۔۔۔!

''چچا۔۔۔کہانی طویل نہیں ہے میں مختصر بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔میرا دکھ وہی نسلِ آدم کا دکھ ہے جو وہ صدیوں سے بھوگ رہا ہے وہی کہانی ہے جو بار بار زمین پر نئے کرداروں کے ساتھ دہرائی جا رہی ہے۔نسلیں بدل جاتی ہیں۔ایک کے بعد دوسری نسل زمین پر اپنی عمریں کھینچتی ہے لیکن دُکھ، درد اور مسائل وہی ہیں جو ہر گھر میں موجود ہیں۔مختصر بیان اس لیے کہ لوگ لمبی کتھا سے اس دور میں اُکتا جاتے ہیں۔''

درد کی پہلی گانٹھ کھل گئی۔۔اس کی بیوی نے چارپائی پر آلتی پالتی مارتے ہوئے بات کو گرہ لگائی۔''ان کے دماغ کی شریان پھٹتے پھٹتے بچی ہے خالہ۔۔ہسپتال داخل رہے ہیں۔ان کا اوپر والا بلڈ پریشر دو سو اور نیچے والا ایک سو تیس پر پہنچ گیا۔رات کی نیندیں ان کی ختم ہو گئی ہیں اب گولی لے کر مصنوعی نیند کے سہارے زندگی گزار رہے ہیں۔مصنوعی نیند کے سہارے آدمی بہت سال نہیں جی سکتا۔میں نے انہیں مجبور کیا کہ ہمیں کچھ دن گاؤں جا کر گزارنا چاہئیں۔آؤٹنگ ہو جائے

گی آب وہوا کی تبدیلی سے ڈاکٹر کہتے ہیں بڑا فرق پڑتا ہے۔'' چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس نے کرسی کی پشت پر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''چچا۔۔۔ابا دنیا سے گئے تو میرا ایک ہی قصور تھا میں گھر میں سب سے بڑا تھا۔حتی المقدور میں نے معاملات کو حل کیا۔بہنوں اور بھائیوں کو زمین کا ٹھیکہ پورا پورا ادا کرتا ہوں۔ فیکٹری کی آمدن میں بھی کبھی ڈنڈی نہیں ماری۔لیکن میں حیران ہوں کس دن کس وقت ہماری باہمی محبت کی دہلیز کو دیمک لگی۔چھوٹی چھوٹی باتیں کب بھانبڑ بن گئیں۔میں فرشتہ نہیں ہوں مجھ میں بھی خامیاں ہوں گی۔لیکن میری مکمل آنکھ اس وقت کھلی جب مجھے وقت نے گواہی دی کہ میری بہنوں کے دل میں میری محبت دم توڑ گئی ہے۔کیوں کیسے کب۔۔۔نہیں معلوم۔۔۔عورتوں کی کُڑ کُڑ میں میرے بھائیوں نے کب نفرت پالی اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔زمینوں کے معاملات کی شکایات،فیکٹری کے مالی امور میں ان کی بدگمانی۔۔۔! مجھ سے بات کر لی ہوتی جب ابا کے بعد ان کا حصہ ان کو ادا کر سکتا ہوں تو شکایات کے ازالہ بھی کرتا۔وہ یہاں وہاں بات کرتے رہے۔بات ہوا پکڑتی رہی۔زبان سے کچھ نکلتی ہو گی،رنگ کیا کیا پکڑتی گئی۔میری بہنیں کب میری بیوی سے نالاں ہوئیں۔۔۔؟ حالانکہ یہ سامنے بیٹھی ہے آپ حیران ہوں گے اس نے ہمیشہ مجھے ان کا خیال رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ان کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ مجھے ان کے ساتھ نرم رویے کا کہتی ہے۔''

میری ایک بہن کو گلہ ہے۔۔۔ہم ان کو پروٹوکول نہیں دیتے۔۔۔یہ پروٹوکول کیا ہوتا ہے۔۔۔؟

اپنوں میں تو اپنائیت ہوتی ہے۔صلہ رحمی میں تکلفات کا کیا گزر۔۔۔گزشتہ برس میری بہنوں نے عیدی واپس بھجوا دی۔آپ یقین کریں میں نے تینوں کو زیرو میٹر گاڑیاں نکلوا کر

دیں۔ مجھے کوئی پروٹوکول کوئی ریٹرن نہیں چاہیے تھا۔ جانے وہ کون لوگ ہیں جن کی باتیں سن کر وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہیں چچا کہیں ہم آپس میں سوتیلے تو نہیں۔۔۔۔!''

''نہیں نہیں بیٹا۔۔میں سمجھ رہا ہوں۔دھاگے اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔۔۔ بیٹا۔۔۔مشورہ دینے کی پوزیشن میں جانے ہوں یا نہیں۔ایک دو باتیں عرض کرتا ہوں۔۔۔تجربے کا نچوڑ کہہ لو۔

مشترکہ خاندان کا تانا بانا بکھرنے کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوا ہے کہ ہر فرد تنہا ہو گیا ہے۔دوسرا ہر آدمی اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھتا ہے۔زرداری کی اندھی دوڑ، نے عقل پر پٹی باندھ دی ہے۔چھوٹے بڑے کی تمیز ختم ہو گئی ہے۔احترام کا لفظ متروک ہو چلا ہے۔خاندان میں ایک بزرگ کی اہمیت اور اس کے فیصلے ہمیں بہت سی قباحتوں سے بچا لیتے تھے۔بزرگ کے ختم ہونے سے خاندان کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی ہے۔خاندان افراد کا مجموعہ ہوتا ہے ہر فرد کا مزاج اور سوچ الگ ہوتی ہے۔ہم اسے بدلنا بھی چاہیں تو نہیں بدل سکتے۔انسانی فطرت نہیں بدلتی۔رویے اچھے ہوں یا بُرے،مزاج کا حصہ ہوتے ہیں،ہم خاندان کے ہر فرد کا مزاج اپنے مزاج کے مطابق نہیں ڈھال سکتے۔یہ بھول جاؤ۔ایسا ممکن نہیں ہے لیکن زمین پر زندہ بھی تو رہنا ہے۔سکھ کا سانس بھی تو تلاش کرنا ہے۔یہ مشکل ضرور ہے لیکن تم رویوں پر کُڑھنا چھوڑ دو۔دوسروں کی کہی ہوئی بات اپنے اوپر کیوں سوار کرتے ہو۔۔۔؟ بات کرنے والے ایک جملہ کہہ کر، تیلی پھینک کے اپنی دنیا میں مگن ہو جاتے ہیں اور تم اسی ایک جملے کو ناسور بنا کر کڑھتے رہتے ہو۔۔۔کیوں بیٹا۔۔۔کیوں آخر کس لیے۔۔۔کیا تم ان کے غلام ہو۔۔تم ایک جملے کے غلام بن جاتے ہو۔۔۔آزاد اور مثبت سوچ رکھنے ولا انسان کبھی رویوں کا غلام نہیں ہوتا۔کسی کو دکھ نہ دو کسی کا برا نہ سوچو اپنی مصروفیات پال لو ان میں کھو جاؤ۔۔۔ بیٹا۔۔۔ یہ روگ نہ پال۔۔۔دوسروں کی باتیں سن کر کڑھنے والے

لوگ کمزور ہوتے ہیں وہ بہت جلد تھک جاتے ہیں۔ صحت اور زندگی ہار جاتے ہیں میرا مشورہ ہے تم زمین اور فیکٹری کے حصے بھائیوں بہنوں کے حوالے کردو۔ اپنے بیوی بچوں کے حصے کا وقت کہیں اور کیوں بانٹ آتے ہو۔ یہ بھی تو خیانت ہے نا۔۔۔دوسروں کا بوجھ کب تک ڈھوتے رہو گے۔ بہت کٹھن ہوتا ہے۔ انہیں اپنا بوجھ خود ڈھونے دو۔''

رات بھیگ چلی تھی۔

ایک بزرگ کی موجودگی نے وہ سارے درو ھن لیے تھے، جسے سہتے سہتے اسے بلڈ پریشر اور انجائنا نے آلیا تھا۔ اس کا شاید کتھارسس ہو گیا۔۔ کہیں کوئی ایک شخص ایسا نہیں تھا جو اس کو اتنا وقت دیتا اس کی تنہائی کاٹتا۔۔ تنہائی کا صحرا کاٹنے والی دوائی ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی۔ وہ بستر پر لیٹا تو اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چچا نے گٹھڑی اس کے سر سے اتار لی تھی۔ اس نے دیکھا لالٹین دروازے کے درمیان روشن رہنے دی گئی تھی کہ خدانخواستہ بجلی جائے تو مہمانوں کو تکلیف نہ ہو۔ اس رات اسے بغیر دوائی کے گہری نیند آئی۔ وہ دو تین روز کا پروگرام لے کر آئے تھے۔

(۲)

اس رات بھی بارش ہو رہی تھی۔

لالٹین دونوں کمروں کے درمیان رکھی روشن تھی۔

فون کی گھنٹی پر اس نے ریسیور اُٹھایا تو اس کی آواز میں خوشی تھی۔

''کس کا فون تھا۔۔۔'' بیوی نے پوچھا۔

''عاصم تھا۔ ان کے معاملات طے پا گئے ہیں۔''

''مسائل حل ہو گئے۔''

دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔ بہو کہہ رہی تھی اب یہ نیند کی دوائی کے بغیر سو جاتے ہیں۔ بلڈ پریشر کی دوائی بھی کم ہو گئی ہے۔ تیرا بھی شکریہ ادا کر رہے تھے۔۔۔ بہت خوش تھے۔۔۔ بہت خوش تھے۔۔۔ بہت۔۔۔ خوش۔۔۔!

''یہ آپ کانپ کیوں رہے ہیں۔۔۔؟''

اس نے لالٹین کی لو اُونچی کی۔

''کچھ نہیں۔۔۔ بلڈ پریشر والی گولی نکال دے اور ہاں لالٹین جلتی رہے مجھے اندھیرے سے خوف آتا ہے۔''

''فون پر اور کون سی ایسی بات ہوئی کہ تم دکھی ہو گئے۔۔۔''

''کچھ نہیں اپنے بچے یاد آ گئے۔ کئی سال گزر گئے اب تو کبھی فون بھی نہیں آیا۔'' یکایک اس کی آنکھوں پر دکھ کی بارش تیز ہو گئی اور خوش بخت کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لالٹین زور زور سے بھڑکنے لگی۔

☆☆☆

بوسیدہ آدمی کی محبت

وہ اتنی آہستگی اور خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا کہ مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ میں ٹالسٹائی کے ناول ''آنا کارینینا'' میں کھویا ہوا تھا۔ کئی برس قبل کے روسی معاشرے میں اپنے آپ کو سانس لیتا محسوس کر رہا تھا۔ تمباکو کی ناگوار بو میرے نتھنوں میں گھس کر میری سانسوں کی آمد ورفت میں رخنے ڈالنے لگی تو میں روسی معاشرے سے پلٹ کر اپنے کمرے میں آ موجود ہوا۔ وہ میرے بستر پر آلتی پالتی مارے سگریٹ پی رہا تھا۔ ایش ٹرے کی بجائے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر راکھ جھاڑنا اس کا معمول تھا۔ وہ ایک بے ترتیب شخص تھا۔ اس کے اندر ہر لحہ جوڑ توڑ اور توڑ پھوڑ جاری رہتی اور اس سارے عمل میں وہ مجھے بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتا تھا۔ اس کے گھریلو مسائل بڑے

گمبھیر تھے وہ نظر انداز کیے جانے کے عذاب سے گزر رہا تھا۔ وہ بلا کا ذہین تھا۔ اسے کثیر المطالعاتی شخصیت بھی کہا جاسکتا ہے لیکن اپنے آپ سے ناراض ناراض رہنے کے سبب اس کی شخصیت عجب ڈھب کی بن گئی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا کہ اس کے اندر کہیں ایک پھانس ہے جو یوں اٹکی ہوئی ہے کہ اسے بےکل کیے دیتی ہے۔ میری اپنی مصروفیات تھیں جنہیں ہر بار تیاگ دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ آج پھر وہ اپنے دُکھوں سے اُلجھ رہا تھا اور میں ٹالسٹائی کے سحر سے باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ اس پر ایک نظر ڈال کر میں پھر روسی معاشرے کے ایک کردار سے گفتگو میں کھو گیا وہ اس گفتگو میں مخل ہوا۔

''میری بھی ایک ''آنا کارینینا'' تھی۔۔۔!'' اس نے راکھ ہتھیلی کے ایش ٹرے میں جھاڑی۔ میں نے ناول بند کر دیا مجھے معلوم تھا کہ وہ مسلسل دراندازی کرے گا۔

اس کی باتیں سننا ناگزیر تھا۔

''کہو۔۔۔'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''میری کہانی لکھو گے۔۔۔؟'' اس کے چہرے پر راکھ پھیلی تھی۔

''محبت اور صنفِ نازک کے موضوع پر، اس نے مجھے چونکا دیا تھا کیوں کہ یہ اس کی فیلڈ ہی نہیں تھی۔ تمہاری کہانی میں ہے کیا جسے قلم بند کیا جائے۔''

''میری بات سنو۔۔۔ تم دُنیا کے ہر موضوع پر قلم آزمائی کرتے ہو۔ کرنٹ افیئرز میں سے افسانہ تراش لیتے ہو ملکی اور بین الاقوامی حالات تمہارے قلم کی زد پر رہتے ہیں۔ عراق سے افغانستان تک امریکی جہاز B-52 سے گرایا جانے والا ڈیزی کٹر بم یوں لگتا ہے تمہارے سامنے تیار ہوا ہے۔ حکمرانوں اور نظامِ حکومت پر چوٹ کرنے سے تم باز نہیں آتے لیکن میری محبت کی کہانی رقم کرنا تمہارے لیے ایک مشکل امر ہے۔ یہ ایسا جانگسل مرحلہ ہے کیا جس میں سے تم نہیں

گزر سکتے!''

اس نے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے ایک ہی سانس میں یہ ساری باتیں کہہ ڈالیں۔تم اور محبت۔۔۔؟

''کیا مجھے محبت نہیں ہو سکتی۔شجر ممنوعہ ہے کیا میرے لیے۔۔۔؟''

''میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے۔''

''انداز تو تمہارا ایسے ہے جیسے مجھ سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے۔''

''دوست اس موضوع پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اب ایسی کہانیاں فرسودہ لگتی ہیں۔۔۔!''

''تم انسانیت کے لازوال جذبے کو فرسودہ کہہ رہے ہو۔۔۔؟''

میں نے اس کی بات اُچک لی۔

''مجھے محبت جیسے لافانی اور عالمگیر جذبے کی سچائی سے انکار نہیں لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا۔'' وہ اِموشنل ہو رہا تھا۔''کیا آدم کے لیے تنہا رہنا ممکن نہیں تھا۔جنت میں کس چیز کی کمی تھی۔حوا کی خواہش کیوں پیدا ہوئی؟ بولو۔۔۔،۔۔۔کیوں،خلیفۃ الارض کی بقا عورت اور مرد کے وجود کی مرہونِ منت ہے۔''

''معلوم ہے مجھے۔۔۔!'' میں نے دفاع کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر میری کہانی لکھو۔۔۔''

''بولو۔۔۔''

''وہ لیلیٰ ہے۔۔۔نہیں نہیں۔۔۔ہیر۔۔۔بلکہ وہ لیلیٰ ہے نہ ہیر اور نہ ہی سوہنی۔وہ اِن سب روایتی قصوں سے زیادہ خوب صورت اور نفیس ہے۔بالکل کرسٹل پیس۔۔۔ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہیں ٹوٹ نہ جائے۔وہ جہاں سے گزرتی ہے اس کا نقشِ پا پھولوں کی کیاری میں

بدل جاتا ہے ہر پھول میں اس کے بدن کی مہک ہوتی ہے۔''

''یہ کہانی مجھ سے نہیں لکھی جائے گی۔۔۔!''

''کیوں۔۔۔؟''

''وہی روایتی باتیں، روایتی قصے، لبِ لعلیں، کاکل ورخسار کی باتیں۔''

''یار۔۔۔جس انہماک سے تم آنا کارینینا کا مطالعہ کررہے تھے اسی انہماک سے میری کہانی نہیں سن سکتے کیا۔ یہ ناول بھی تو ایک کہانی ہے۔تم اور کہانیاں لکھو گے۔ مجھے معلوم ہے تم پندرہ روز میں بدلنے والی پٹرولیم کی قیمتوں کا اِن میں ذکر کرو گے۔''

''میں ایسا افسانہ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔۔۔!''

''ایک روز تم لکھو گے کیونکہ تم لکھاری ہو۔تمہارے دماغ کے خلیوں میں جس روز یہ بات جڑ پکڑ گئی تا کہ ہر پندرہ روز بعد پٹرولیم کی قیمتیں بدلنے سے پندرہ کروڑ عوام پر کیا گزرتی ہے وہ کس ذہنی عذاب اور کرب سے گزرتے ہیں تو تم اس میں سے افسانہ تراش لو گے لیکن میری محبت کا قصہ تمہیں فرسودہ دکھائی دیتا ہے۔ آج وہ واقعی مجھے اپنی کتھا سنانے پر تُلا ہوا تھا۔جس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔''

''سن رہے ہو۔۔۔نا۔۔۔وہ جہاں پاؤں دھرتی تھی وہاں پھول کھلتے تھے۔''

''اب آگے بھی کہو۔ میرے پاس میرؔ امن دہلوی کا قصہ چہار درویش سننے کا وقت نہیں ہے۔ یہ نئی صدی ہے نئے تقاضے ہیں۔اب افسانہ بھی داستان کی طرح متروک ہونے والا ہے اور صرف دوسطری افسانچہ ہی تراشا جائے گا کیونکہ آج کے انسان کی برق رفتار مصروفیات اسے اتنا وقت ہی نہیں دیتیں کہ وہ مطالعہ کرے۔ بستر پر گرکر اسے صرف اتنا یاد رہتا ہے کہ مجھے **سلیپنگ** پلز لینی ہیں اور صبح ہونے پر پھر اِنسانوں کے جنگل میں گم ہو جانا ہے۔ رزق تلاشنا ہے عجیب عہد ہے

یہ! یہاں تو قیر کا معیار دولت ہے یہاں کامیاب اِنسان اُسے گردانا جاتا ہے، جس کے پاس مرسڈیز ہو، لینڈ کروزر، کوٹھی، بینک بیلنس، شاندار بین الاقوامی بزنس، آئے دِن نئے ماڈل کی کار اور عورت خریدنا اس کا مشغلہ ہو اور تم قدیم عہد کے اِنسان اپنی نامعلوم محبت کا قصے لے بیٹھے ہو۔ متروک عہد کی تو اب باقیات بھی کہیں نظر نہیں آتیں۔''

میری گاڑھی گفتگو سے شاید اسے دھچکا لگا وہ اُٹھنے لگا تو میں نے سوچا چلو ایک اِنسان کی دِل جوئی کے لیے ہی اس کی پوری کتھا سن لی جائے۔

کارِثواب کا سوچ کر میں اپنے آپ پر ہنسا۔

ہر کام کا ہم ریٹرن چاہتے ہیں۔۔۔وہ کیش کی شکل میں ہو یا ثواب کی شکل میں!

''حسبِ معمول'' اس نے سگریٹ کا سرا زبان کے لعاب سے تر کیا۔لائٹر کے شعلے اور اس کی آنکھوں کے رنگ میں مماثلت تھی اور اسی رنگ میں اس کی کہانی پنہاں تھی!

میرے ذہن کی منتشر سوچوں کو اس کی کہانی نے ایک نقطے پر مرتکز کر دیا۔ میں ہمہ تن گوش تھا۔سگریٹ کا دھواں اور اُس کی ہتھیلی پر راکھ تھی جو ہاتھوں کی آڑی ترچھی لکیروں کو دُھندلاتی تھی۔ وہ بولتا تھا تو لفظ پھولوں میں بدلتے تھے۔ وہ پیکر تراشی کرتا تھا اور اپنی محبوب کی اداؤں سے ماحول کو معطر کرتا تھا۔ وہ لڑکی جس سے اسے محبت تھی اس کا ہیولا سانس لیتا محسوس ہونے لگا تھا۔وہ متشکّل ہوتی چلی گئی اپنی تمام تر اداؤں سمیت وہ میرے سامنے نہیں تھی، پھر بھی تھی!

اُس کا انتخاب اُسی کو معلوم تھا لیکن جانے کیوں وہ میری بھی رُوح میں اُترنے لگی تھی۔ میں اس کی آنکھوں، چہرے اور باتوں میں مناسبت تلاش کرتا رہا وہ اس کی آنکھوں میں تھی، چہرے اور باتوں میں بھی اس کی خوشبو تھی۔ وہ اسے کہاں ملی، کیسے ملی؟ ان باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔اس کا کہنا تھا بس وہ مجھے مل گئی اور میں موسموں کی پہچان بھول گیا۔

کہانی میں کوئی ٹرننگ پوائنٹ نہیں تھا۔۔۔

وہ بول رہا تھا اور میں سن رہا تھا۔

''وہ مجھے اتنا ٹوٹ کے چاہنے لگی تھی کہ کسی نے کسی کو کیا ٹوٹ کے چاہا ہوگا۔صرف وہی تھی جو میرے دُکھ سکھ محسوس کرتی تھی، بانٹتی تھی، میرا خیال رکھتی تھی، میں جسے گھر کے ہر فرد نے نظر انداز کیا۔ میں تو خودکشی کے آخری کنارے پر کھڑا کسی اور جہاں کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا ،جب اس نے مجھے اپنی مرمریں بانہوں کے حصار میں لے لیا۔اس روز مجھے یقین ہوگیا زندگی میں ایک ہستی ایسی ضرور ہو جو اُسے ٹوٹ کر چاہے جس سے دُکھ بانٹے جا سکیں۔ جو اپنا وقت وار دے۔جب وہ فون کے اس سرے پر ہوتی جو بے جان پلاسٹک سے بنا تھا تو اس کی آواز بے جان چیزوں میں جان ڈال دیتی۔اس کی آواز میرے بدن اور رُوح کے خلیوں میں زیست بن کے تیرتی، میں میں نہ رہتا وہ ہوجاتا۔۔۔میں گراہم بیل کو دُعائیں دیتا۔وہ میرا اتنا زیادہ خیال رکھتی تھی کہ تمہیں اب بتا پانا میرے لیے ممکن نہیں ہے، بالکل ایسے جیسے آنگن میں لگے گملوں کے پودوں کا خیال رکھنا اسے اچھا لگتا تھا۔اس کی باتوں کی پھوار سے میں بھیگتا اور نمو پاتا تھا۔ میں باتوں کی اور یادوں کی ڈائری کا ایک ایک ورق کھول کر تمہارے سامنے رکھ دوں تو تمہارے اس ٹالسٹائی کے ناول سے بڑا ناول تیار ہوجائے گا۔موسیقی میں وہ نصرت فتح علی خان کی پوجا کی حد تک پرستار تھی، سر دھنتی تھی سُروں پر! اسے موسیقی کا دیوتا مانتی تھی۔کبھی کبھی کمرہ بند کر کے ڈیک پوری آواز میں کھول لیتی۔

آجا تینوں اکھیاں اُڈیکدیاں۔دِل واجاں ماردا۔۔۔

ڈیک کی آواز سے کھڑکیوں کے شیشوں میں تھرتھراہٹ پیدا ہوتی وہ لرزتے، تھرتھراتے یوں لگتا ابھی ریزہ ریزہ ہوجائیں گے۔اس کی آنکھوں سے بھی موسیقی بہنے لگتی بچوں کی طرح

کھلکھلاتی، چھیڑتی تنگ کرتی اور کہتی۔۔۔سن رہے ہو۔۔۔،۔۔۔دھیان سے سنا کرو اور نصرت فتح علی خان مسلسل کہہ رہا ہوتا۔

''تینوں اکھیاں اُڈیکدیاں، دِل واجاں ماردا''

وہ کہتی ''تم جہاں بھی رہو گے یہ دل تمہارے لیے دیئے کی مانند جلتا رہے گا۔ میں آنسوؤں کے تیل سے اسے روشن رکھوں گی۔ اگر میں مر بھی گئی نا۔۔۔تو میری کھلی آنکھوں میں تیرا انتظار ٹمٹماتا رہے گا۔''

''میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا۔ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔''

''ایسی دُکھ دینے والی باتیں نہ کیا کرو۔۔۔''

وہ کھلکھلا کر ہنستی اور کہتی ''موت تو ازلی حقیقت ہے۔''

میں پہروں سوچتا رہتا اپنے آپ سے اُلجھتا رہتا۔ ''یہ ایسا کیوں سوچتی ہے شاید میں اس سے پہلے گزر جاؤں۔''

راکھ ہتھیلی پر جھاڑتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بادل اُتر آئے۔ پوہ کی جھڑی سی لگ گئی۔

وہ خبر نہیں تھی۔۔۔وہ رودیا۔

موت کی خبر تھی یا ازلی حقیقت مجھے نہیں معلوم لیکن میرے اندر میری پوری زندگی مرگئی۔ میرے جنازے کے اردگرد اس کی یادیں بیٹھی بین کررہی تھیں۔ ہر یاد الگ کُرلاتی اور ماتم کرتی تھی۔ مجھے خبر ہی نہیں تھی میں کب فنا کے دروازے سے گزر رہا ہوں، مجھے اپنے جنازے کا وقت بھی معلوم نہیں تھا۔ کندھا کس نے دینا ہے؟ فنا کے دروازوں سے گزر جانے والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ اس سے بھی بے خبر ہوتے ہیں کہ کتنے لوگوں نے سوگواری کا کفن پہنا، بس وہ گزر جاتے

ہیں۔ نئے جہانوں کی خبر بھی پلٹ کر نہیں دے سکتے۔

''میں بھی فنا سے بقا کو نکل گیا۔''

''اب کوئی نقشِ پا پھولوں کی کیاری میں نہیں بدلے گا۔''

''رنگِ حنا مخروطی اُنگلیوں کے کنارے اٹھکیلیاں نہیں کرے گا۔''

''کیا اس کی آنکھیں اب بھی کھلی ہوں گی۔''

''کیا وہ فنا کے جہاں سے گزر کر بھی مجھے اُڈیک رہی ہوگی۔''

سوالوں کا لامتناہی سلسلہ میرے اندر پھیلتا سمٹتا رہتا ہے۔ سینکڑوں یادیں میرے اندر ماتم کناں رہتی ہیں۔ میرے دل کی سرخ زمین پر کُرلاتی اور اُسے تلاش کرتی ہیں۔

میں اس کے گھر تک کیسے پہنچتا ہوں؟ مجھے نہیں معلوم! مگر جب میں وہاں جاتا ہوں تو وہ صحن کے وسط میں بچھی چارپائی پر پُرسکون، نیند کی وادیوں میں ہمیشہ کے لیے اُتر چکی ہوتی ہے۔ کفن میں چہرے کو چھپائے ہوئے۔ مگر مجھے یوں لگتا ہے درونِ کفن آنکھوں میں میرے انتظار کی قندیل روشن ہے۔

میز پر رکھے ٹالسٹائی کے ناول آننا کارینینا کے سارے کردار ناول سے نکل کر میرے اردگرد اکٹھے ہوگئے۔ ان میں استی پان ارکاویچ تھا، ڈالی اور لیوین، گریشیاء اور ابلونسکی! پورے ماحول پر مرگ کا دھواں پھیلا تھا۔۔۔

وہ میرے سامنے بیٹھا تھا، چپ، سوگوار اور اُجڑا اُجڑا سا ناول کا ایک زندہ کردار!

''میرے دوست تمہاری محبت کا انجام انتہائی دردناک اور الم ناک ہے۔''

''میری کہانی تو اب شروع ہوئی ہے۔۔۔'' اس نے سگریٹ کی خالی ڈبیا موڑ توڑ کر ڈسٹ بِن میں پھینکتے ہوئے کہا ''میں سمجھا نہیں۔۔۔''

اُس نے راکھ ہتھیلی پر جھاڑتے ہوئے کہا۔۔۔ ''میں بھی نہیں سمجھا، مجھے کیسے ملی تھی اور ملتی بھی کیسے یار۔۔۔ مجھ ایسے بدصورت اور بوسیدہ آدمی سے بھلا کون محبت کرے گا۔۔۔؟''

☆☆☆

امام غزالی کا گم شدہ کردار

لڑائی طول پکڑتی گئی۔

دونوں کے دِل کی دیواریں نوکیلی کنکریوں کی آواز سے زخمی ہو چلی تھیں۔ اس کی آواز بلند تھی۔ گھر سے جانے کے بعد بھی اس کی سماعت پر بیوی کے تُرش رویے کے زخم تازہ تھے۔ یہ ایک بے جوڑ شادی تھی۔ دونوں کو یوں محسوس ہوتا تھا وہ گھر میں نہیں بلکہ ریلوے اسٹیشن کے ایک پرانے بینچ کے مخالف سروں پر بیٹھے ہیں۔ کئی برس گزرنے کے باوجود بینچ کے درمیان کا فاصلہ بتدریج سمٹنے کے بجائے پھیل رہا تھا۔ بیوی کے جانے کے بعد وہ بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ان کانچ کے گُل دانوں کی کرچیاں دیکھ رہا تھا جو اس کی بیوی نے قالین پر پٹخ مارے تھے۔ تہہ کیے

لحاف پر دو تین کتابیں بکھری تھیں۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے شیشے کے گلاس میں چند گھونٹ پانی تھا۔ سامنے دیوار پر بے آواز کلاک تھا اس کی اپنی سانس کی آواز اسے چبھ رہی تھی عجیب کسلمندی سی اس کے وجود میں رچی تھی۔ اس نے چاہا دو گھونٹ پانی حلق سے اُتار لے لیکن گلاس تک کا فاصلہ ریلوے بینچ کی مانند پھیل گیا۔ وہ سوچنا چاہتا تھا کوئی بات کوئی ایسا خوبصورت لمحہ جو اس کی تکان اُتار ڈالے لیکن مصروفیات کی خودرو جھاڑیوں میں اس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ اس نے سر سے مصروفیات اور مسائل کو جھٹکا اور گزرے ایام کا ایک واقعہ ذہن کے کینوس پر رنگ بھرنے لگا۔ اسے بہت سال کی مسافت ایک ثانیے میں طے کرنا پڑی لیکن مسافت کے اُس پار یادوں میں اتنی روشنی ضرور تھی کہ چند لمحوں کے لیے اس نے ماضی کی کھڑکی سے ان سارے منظروں کو پکڑنا چاہا جو اُسے رُلاتے اور ہنساتے تھے۔ اسے یاد آیا ایک واقعے نے اوائل عمر میں اس کی سوچ کے زاویے بدل دیے تھے۔

کیا کسی کا عملی کردار اس حد تک مؤثر ہو سکتا ہے کہ کسی کی قلوبِ کیفیات ہی بدل ڈالے۔

وہ کون تھا؟ میرے جیسا ایک اِنسان لیکن کتنا مختلف! میرے اندر طنطنہ تھا۔ رعونت سیخ پا ہو جانا اور وہ کتنا دھیما تھا متحمل اور بردبار۔۔۔! تخیل میں اس کی بیوی نے پھر جست بھری۔ اس کے اندر انتقام نے انگڑائی لی۔ اس نے لمبا سانس کھینچا۔ انگڑائی توڑ کے بستر سے اُٹھا پاؤں میں چپل اڑسے اور لان میں نکل آیا۔ چودھویں کا چاند جوبن پر تھا۔ فضا میں خنکی تھی۔ کندھوں پر اُس نے کالی شال ڈال رکھی تھی۔ دُور کہیں ریلوے لائن پر سے گزرتی ٹرین کی دھمک اور وِسل کی معدوم ہوتی ہوئی آواز اسے سنائی دی وہ ٹہلتا اور سوچتا رہا کہ کیا مجھے بیوی کو جا کے منالانا چاہیے جو میرا معمول ہے یا۔۔۔؟ ''یا'' کے بعد ایک بے انت خلا تھا۔ قصور تو اسی کا ہے۔ متمول خاندان کی رعونت نے اس کے منہ میں قینچی بھر دی ہے۔ شکر ہے آج میرا ہاتھ نہیں اُٹھ گیا لیکن صبر کی کوئی حد

کوئی سرا تو ہو۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں بجز ہم دونوں کے اتفاق اور محبت کی۔۔۔! یہ جنسِ نایاب کہیں بازار سے دستیاب ہوتی تو زیور، کپڑے، ہیروں کے نیکلس کی طرح خرید دیتا لیکن۔۔۔؟

اُس نے ایک بار ارادہ باندھا کہ اسے منا لائے لیکن رات اس کے اندر تحلیل ہوگئی۔

کچھ دیر رُک گئی ہوتی۔ صبر کرلیا ہوتا تو معاملہ ٹھنڈا ہوجاتا لیکن وہ تو زلفیں جھٹکتی چھنگلی میں کار کی چابی گھماتی مجھے بیگانہ نظروں میں تولتی یہ جا وہ جا۔۔۔

اسے سردی کا احساس ہوا۔ وہ کمرے میں واپس آیا۔ لحاف پر سے کتابیں سمیٹ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھیں۔ مطالعے کے لیے ایک کتاب کھولی لیکن چند اوراق پلٹ کر کتاب بند کر کے رکھ دی۔ اس کا من بے چین تھا۔ من بے چین ہو تو کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ اسے پھر وہ ایک شخص یاد آیا جس نے اس کے من کی دنیا بدل ڈالی تھی وہ اپنے آپ سے اُلجھ پڑا آج کیا ہوا؟ میں نے پلٹ کر بیوی کو کیوں ڈانٹ پلادی۔ میں تو عادی ہی گھونٹ بھر جانے کا رہا ہوں۔ اس شخص کی تعلیم کا ماحصل ہی یہی تھا۔ خاموش عملی تعلیم وعظ نہ نصیحت، بس نمونہ مکمل نمونہ!

(۲)

ہوسٹل کی زندگی اسے یاد آئی۔۔۔!

چوتھائی صدی اس کے وجود کو چیر گئی۔ واقعات نسیان کی گرد میں اٹے پڑے تھے۔ اتنی گرد جھاڑنے کا وقت کہاں سے لایا جائے۔ وہ کھلنڈرا تھا۔ بات بے بات اُلجھ جانے والا اکھڑ، خودسر، ضدی، تُندخو، کوئی اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو بہت پسند کرتا تھا آئینے میں اس کے چہرے کی چمک اسے تسکین دیا کرتی تھی۔ دوسروں کو پامال کر دکھانے کی خودسری اُس کی سرشت میں رچی بسی تھی، لڑائی کا بہانہ تلاش کرلینا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ عصر کے بعد ہوسٹل کے لان میں وہ ''گتکا'' چلانے کی پریکٹس کرتا تو گتکے کی لاٹھی اس کی دونوں ہتھیلیوں میں تیزی سے

گھومتی بدن کے اطراف میں سرسراتی یہ سرسراہٹ اسے بے خود کر دیتی۔

ایک روز وہ لاٹھی گھمارہا تھا کہ وہ سرسراتی ہاتھوں سے پھسلتی ایک لڑکے کے سر سے جاٹکرائی۔۔۔وہ سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔۔۔

''اوئے تجھے اتنا قریب کھڑا ہونے کو کس نے کہا تھا۔۔۔''

یہ کہتا ہوا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے کو چل دیا۔اس سے اُلجھنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔چند روز پہلے ایک واقعے نے اس کی ایسی دھاک بٹھادی کہ ہر لڑکا اسے ماورائی مخلوق یا فلمی کردار سمجھنے لگا۔ہوسٹل میں دھڑے بندیاں تھیں۔منافرت نے دو گروہوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔جس علاقے سے وہ متعلق تھا وہ جنگجو کہلاتے تھے۔مخالف گروہ پوری تیاری کے ساتھ سہ پہر کے وقت ہوسٹل کے لان میں آبراجمان ہوا اور جن سے مناقشت تھی وہ کمروں میں مسلح بیٹھے پنجہ آزمائی کو تیار تھے۔یہ اس گروہ سے تھا جو کمروں میں مسلح حملے کو تیار بیٹھے تھے۔لان میں فریق مخالف کا ایک نوجوان جو گروہ کا سرغنہ تھا گہرا سانولا رنگ، بائیں کان میں مُندہ، کلائی میں کڑا لوہے کا اور اس نے پنڈلی کے ساتھ پستول باندھ رکھا تھا۔اس کی آنکھیں بنٹے کی مانند گول گول تھیں، مونچھیں اطراف سے اُٹھی ہوئی نوک دار اور ہاتھ میں لہراتا مضبوط چمڑے کا بید۔۔۔! سناٹا ایسا کہ ہول آتا تھا۔جو لڑائی کا حصہ نہیں تھے وہ لڑکے چھپ کر خوف زدہ نظروں سے منظر دیکھ رہے تھے۔اچانک غیر متوقع طور پر وہ نمودار ہوا گتکے کے لٹھ کو گھماتا ''گتکا'' جس کے سرے پر اس نے دودھاری خنجر باندھ رکھا تھا بے خوف لان میں داخل ہوا سیدھا چلتا سرغنے کے سامنے آیا۔

پوری طاقت سے لٹھ خنجر کی جانب سے زمین میں گاڑا۔۔۔اور گرج دار آواز نے سناٹا توڑا۔۔۔

''اوئے کھول پستول پنڈلی سے۔۔۔۔ میں تیرے سارے خاندان کو آج چیر دوں گا۔''

اس کی آنکھیں اُبلتی انگارے برساتی سرغنے کے وجود میں اُتر گئیں۔۔۔

''میں پستول کھول دوں تجھے۔۔۔میرا کاٹا تو پانی بھی نہیں مانگتا۔''

مدِمقابل کو سانپ سونگھ گیا۔۔۔

اتنے میں گولی چلنے کی آواز آئی اور مدمقابل کے سرغنہ نے دیکھا اس کے ساتھی بکھر اور بھاگ نکلے ہیں۔ وہ اُلٹے قدموں پلٹا اور چپ چاپ چلتا گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔۔۔ لڑائی ٹل گئی تھی۔

لیکن لڑائی کبھی نہیں ٹلتی یہ ہر عہد میں چلتی رہتی ہے۔۔۔

اُس روز لڑائی ٹل گئی۔۔۔ وہ کمرے میں آ کر لٹھ سے خنجر کھول رہا تھا کہ اسے خیال آیا۔۔۔گاؤں سے مہمان آنے والے ہیں۔اُن کی آؤ بھگت بھی کرنا ہے۔اس نے ہوسٹل کے وارڈن سے جا کر اضافی کھانے کی درخواست کی اور ٹہلتا ہوا ایک کمرے کے سامنے سے گزرتا رُک گیا۔۔۔! اسے خیال آیا دوستوں سے کیوں نہ ٹیپ ریکارڈر مانگ لوں وہ دستک دے کر کمرے میں داخل ہوا تین ساتھی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔اس نے اپنے قریبی دوست زین العابدین سے کہا۔۔۔

''یار۔۔۔زین۔۔۔ مجھے ٹیپ ریکارڈر چاہیے۔''

''کل لے جانا یار۔۔۔آج ہم کچھ ریکارڈنگ کر رہے ہیں۔ٹیپ ریکارڈر فارغ نہیں۔''

''یار مجھے تو ابھی چاہیے تھا گاؤں سے چند دوست آ نکلے ہیں۔۔۔''

''مجبوری ہے۔۔۔کل لے جانا۔''

انکار اور برداشت چوں کہ اس کے مزاج کا حصہ ہی نہیں تھے وہ کمرے سے نکلا تو سیڑھیاں اُترتے ہوئے غصہ اسے چڑھ چکا تھا۔ وہ اپنے آپ سے ہم کلام تھا یہ توہین ہے۔ میری، میرے منہ پر تھوکا ہے زین نے میں انتقام لوں گا وہ رات بھر غصے کے بخار میں مبتلا رہا۔ اگلی صبح

ایک لاٹھی اُٹھائے وہ زین کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ زین ہوسٹل کے ایک کمرے میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا خوش گپیوں میں مگن تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ لال انگارہ آنکھیں چہرے پر تناؤ۔۔۔! اس سے پہلے کہ کوئی سنبھلتا وہ افتاد کی مانند مغلظات سمیت زین پر ٹوٹ پڑا اس کی کمر پر تین چار لاٹھیاں کھینچ ماریں سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ سب ششدر رہ گئے۔۔۔

زین کی پشت پر لاٹھیاں اور سماعت پر مغلظات جس لمحے برسیں وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اس نے ایک نظر مطیع الرحمن کی جانب دیکھا اپنی قوتِ برداشت کو بروئے کار لا کر اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا:

''مطیع الرحمن۔۔۔ خیریت۔۔۔؟ ہوش میں تو ہو۔۔۔؟''

''ہاں ہوش میں ہوں۔''

''تیرے میرے درمیان تو کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے۔''

''ہے۔۔۔ جھگڑا ہے۔۔۔ کل تو نے مجھے ٹیپ ریکارڈر نہیں دیا اور انکار ہاں انکار میری برداشت سے باہر ہے۔۔۔!''

کمرے میں موجود زین کے دوستوں نے اپنے ہتھیاروں کی طرف ہاتھ بڑھائے لیکن زین نے ان کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔۔۔!

''نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ اسے کچھ نہیں کہنا۔۔۔''

''لیکن تم ہمارے کمرے میں ہو، ہمارے مہمان۔۔۔ ہم اس کی تکا بوٹی کر دیں گے۔''

''پاگلو۔۔۔ انسانوں کی تکا بوٹی نہیں کرتے۔''

''مطیع الرحمن۔۔۔ جتنی لاٹھیاں برسانے کو جی چاہے برسا لو۔۔۔ ٹیپ ریکارڈر تو ٹیپ ریکارڈر تمہارے لیے جان بھی حاضر ہے تم بے سبب ناراض پھرتے ہو۔۔۔!''

کمرے میں سناٹا تھا گہرا سناٹا، اتھاہ خاموشی اور وہ بیٹھا تھا آلتی پالتی مارے بدھا کے انداز میں۔۔۔مطیع الرحمن نے لاٹھی وہیں پھینکی اور اُلٹے قدموں واپس چلا گیا۔۔۔

(۳)

''زین۔۔۔زین العابدین۔۔۔تم نے مجھ پر پلٹ کر اس لمحے وار کیوں نہ کیا۔۔۔؟ مجھے بتاؤ تم نے میرا چین چھین لیا ہے۔''مطیع الرحمن کی آنکھوں میں آنسو تھے اور سردیوں کی دھوپ زرد ہو چلی تھی۔''میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں لیکن تم اتنے عظیم اِنسان ہو مجھے تو معافی مانگنے کا بھی سلیقہ نہیں۔تم نے مجھے معاف نہ کیا تو ضمیر کی سزا زیست کا مقدر ہو جائے گی۔''

''میں نے اُسی لمحے تمہیں معاف کر دیا تھا جب تم نے پہلی لاٹھی ماری تھی۔''

''یہ صبر وتحمل یہ بردباری تم نے کہاں سے پائی ہے تھوڑی سی میرے نام بھی کر دو۔۔۔مجھے بھی جینے کا ڈھنگ آ جائے۔''

مطیع الرحمن۔۔۔عبدالحمید عدم نے کہا تھا:

ع بڑی طویل کہانی ہے پھر کبھی اے دوست

''کبھی وقت نے مہلت دی تو کتابِ زیست کا کوئی ایک ورق تمہارے نام کر دوں گا کتابِ زیست جس میں ورق ورق کتابیں محفوظ ہیں، ہر کتاب میری دوست ہے اور دوستی کا بھرم رکھتی نبھاتی ہے۔''

''مجھے کہیں نہیں جانا۔۔۔آج یہیں وقت کو میں تھامے رکھوں گا۔''مطیع الرحمن نے کہا، اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی روشنی بھی تازہ تھی۔

''مطیع الرحمن۔۔۔کس کس کتاب کا نام لوں؟ کتنے ہی عظیم لوگ زمین سے گزرے اور موجود ہیں جنہوں نے اس حیوانِ ناطق کو اشرف المخلوقات کے منصب تک پہنچانے میں رہنمائی کی

تم تو یہ جاننے کو بے چین ہو کہ صبر ہم نے کہاں سے پایا۔۔۔''

''مطیع الرحمن۔۔۔ میرے ذہن کی لائبریری میں جو کتابیں محفوظ ہیں ان میں ایک کتاب امام غزالی کی 'کیمیائے سعادت' بھی ہے۔۔۔تحمل بردباری، برداشت، نرم خوئی ایسی عمدہ صفات اس کتاب سے نکل کر میرے من میں سما گئیں یہ وہی سلسلہ ہے انبیاء ورسل کا جس نے اِنسان کی رہنمائی کی امام غزالی کا فلسفہ بڑا گہرا ہے۔ اِنسانی جبلت پر بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ ہر اِنسان کی جبلت میں چار خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ شیطان، سور، کتا اور فرشتہ یہ ہر اِنسان کی جبلت کا حصہ ہیں بلاتفریق مذہب، رنگ ونسل۔۔۔!

ہر اِنسان کی جبلت میں غصے کا کتا موجود ہے۔ شہوانی سطح پر سور اور نفرت بغض حسد، کینہ انتقام اور غیبت ایسی برائیوں کا مجموعہ شیطان بھی اس کے نفس میں پنجے گاڑے بیٹھا ہے۔ انسان جب معاملات کے باب سے گزرتا ہے تو مثبت اور منفی قوتیں آپس میں بر سرِ پیکار ہوتی ہیں۔ ملکوتی صفت صبر تحمل، بردباری، خوش اخلاقی ملنساری، عفو ودرگزر بھی حرکت میں آتی ہیں۔ معاملات کے اُلجھاؤ اور جھگڑے کے دوران اگر غصے کا کتا قابو میں نہ رہے تو جھگڑا طول پکڑتا ہے، اگر ہم اپنے نفس کے کتے کو قابو میں نہ رکھ پائیں تو مدِمقابل کے اندر جو نفس میں کتا بیٹھا ہے وہ بھی غراتا ہے اور اگر وہ بھی رسہ تڑالے تو زمین پر قتل وغارت گری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ جھگڑے کے دوران اگر ایک فریق اپنی ملکوتی صفت کو بروئے کار لے آئے صبر وتحمل بردبادی کا ثبوت دے تو فریق مخالف کے اندر موجود ملکوتی صفت جاگتی ہے اور کتے کو پیچھے دھکیل دیتی ہے اور فساد ٹل جاتا ہے۔ میں کمزور عاجز پُرتقصیر میری کیا اوقات، مجھے ملکوتی صفت کی توفیق اس لمحے عطا کی گئی جس لمحے تم نے حملہ کیا اور فساد کے بادل چھٹ گئے۔ مطیع الرحمن اچھی کتابیں مطالعے میں رکھا کرو۔ اِنسانوں کی تلاش میں رہا کرو۔ کتاب اور نیک اِنسان کی صحبت زمین پر سانس لینے میں آسانی پیدا کردیتی ہے۔''

(۴)

وقت کی ترتیب، بے ترتیب ہے۔ زین العابدین کب واپس آیا۔۔۔ اسے اپنی بے ترتیبی کو مرتب کرنے میں مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ زیست لحہ لحہ اِنسان کو معاملات کی سولی پر چڑھائے رکھتی ہے۔

وہ سورہا تھا۔۔۔

نہیں وہ جاگ رہا تھا۔

شاید درمیانی کیفیت تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پر ہڑ بڑا کر اس نے ریسیور اُٹھایا۔

''ہیلو۔۔۔کون۔۔۔؟''

''میں ہوں۔۔۔تمہاری بیوی دروازہ کھولو۔''

''اتنی رات گئے تم۔۔۔؟'' دروازہ کھولتے ہی اس نے سوال کیا۔

''ہاں۔۔۔میں۔۔۔کیا یقین نہیں آرہا۔۔۔'' وہ بیڈروم میں داخل ہوتے ہی بولی۔

''کیسا انقلاب ہے یہ۔۔۔؟ مجھے تو صبح تمہیں منانے کے لیے آنا تھا۔''

''بس۔۔۔کیا کہوں۔۔۔آنکھ کھل گئی میری کہیں گہرے اندر سے آواز آئی، زیادتی ہمیشہ میری جانب سے ہوتی ہے۔ میں بلاسبب جھگڑ کر میکے کا رستہ پکڑ لیتی ہوں آج خیال آیا میرے گھر کا رستہ تو تمہارے دِل سے گزر کر رُوح تک جاتا ہے۔۔۔تم میری ہر زیادتی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے ہو۔۔۔''

''کیا مجھ پر ترس کھا کے لوٹ آئی ہو۔۔۔؟'' زین نے بیڈ لیمپ آف کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔تم پر پیار آ گیا۔۔۔!''

☆☆☆

ڈرائنگ رُوم اک گزرگاہ ہے

ایک روز شام ڈھلے میں ایک میڈیکل سٹور سے دوائی لے رہا تھا کہ موبائل پر Miss Call نے متوجہ کیا۔ نمبر دیکھا تو اجنبی تھا۔ رانگ نمبر معمول ہوں تو توجہ دینا عبث ٹھہرتا ہے۔ وقت کے ضیاع کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ پانچ منٹ بعد اُسی نمبر سے دوبارہ Miss Call آئی۔ تیسری Miss Call آدھ گھنٹے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے روز دوپہر میں اُسی نمبر سے ایک مختصر سا SMS رومن اُردو میں موصول ہوا۔

''کیا میں آپ کے ساتھ رابطے میں رہ سکتی ہوں۔۔۔؟''

''بغیر تعارف کے رابطے بے معنی ہوتے ہیں۔''

''میرا رابطہ بامعنی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔ مجھے ثبوت چاہیے، تمہیں بات بھی کرنا ہوگی۔''

''سر۔۔۔! ثبوت تو پیش کر دیتی ہوں لیکن بات۔۔۔ سرِ دست ممکن نہیں۔''

''چلیے ثبوت SMS کیجیے۔''

''سر۔۔۔ آپ کی تخلیق ''متا'' نے میرا دُکھ بانٹا ہے۔ میرا جی چاہا میں آپ سے رابطے میں رہوں۔ SMS کرنے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔''

اِس SMS کے بعد بہت سے دِن بیت گئے اور میں بھول گیا۔ زندگی کی ذمہ داریاں نبھانا بھی ایک مستقل نوعیت کا جاب ہے۔ قریباً مہینے بعد اس کا SMS آیا ''سر۔۔۔ سہ پہر کا وقت ہے۔ گہرے بادل چھائے ہیں۔ میں آنگن میں درخت کے نیچے بیٹھی سہ پہر کی چائے پی رہی ہوں۔ یہ میرا روزانہ کا معمول ہے۔ یہ ایسا وقت ہے جس میں مَیں اپنی تنہائی سے ہم کلام ہوتی ہوں۔ کیا آپ میری تنہائی بانٹیں گے؟ میں چائے کے کپ پر آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔''

''یہ کیسے بات کرنا آپ کے لیے کیوں ممکن نہیں۔۔۔؟''

''سر۔۔۔ یہ کتھا SMS میں نہیں سما سکتی وقت نے مہلت دی تو دِل کا ورق آپ کو پڑھا دوں گی۔'' پھر وہ اکثر سہ پہر کی چائے کے دوران مختصر سا SMS کرتی۔ چائے کے ساتھ جو بھی لوازمات ہوتے بسکٹ، کیک، سموسے، کباب، سب تفصیل بیان کرتی۔ ''سر۔۔۔! آپ کو خبر ہے میرے سامنے ہمیشہ دو کپ رہتے ہیں۔''

''دو کپ کیوں۔۔۔؟''

''سر۔۔۔ یہ بھی طویل کہانی ہے۔ میرے من کے بنک میں دُکھ کا Credit دِن بہ دِن

بڑھتا جا رہا ہے۔ کوئی تو ایسا آئے جو اِسے کیش بھی کرائے۔ سر!۔۔۔ میں نے اپنے دُکھ اِسی طرح سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں، جیسے الماری میں بچپن کے گڈیاں پٹولے مجھے بچپن لوٹا دیتے ہیں۔"

دِن روز ڈھل جاتا۔۔۔ عمر کا ایک حصہ کاٹ کر۔ مہینے میں دو تین SMS اس کا معمول تھے۔ بات کرنے کا موقع اسے میسر آیا نہ میں نے اصرار کیا۔ وہ ایک معمول کی سہ پہر تھی۔ اس نے Bell دی، پہلی گھنٹی، دوسری، تیسری میں نے کال اٹینڈ کر لی۔

"سر۔۔۔ سلام پیش کرتی ہوں، لمبی بات نہ ہو پائے گی۔ میں ایک ایسی حویلی کی مکین ہوں جس کی دیواریں آسمان کو چھوتی ہیں۔ یہاں سے عورتوں کے صرف جنازے نکلتے ہیں۔ جیتے جی اُن کی جھلک دیکھنا موت کی پکار پر لبیک کہنے کے مترادف ہے۔ سر۔۔۔ میں فون بند کرتی ہوں، پھر سہی اللہ حافظ اپنا خیال رکھیے گا۔"

"میں اکثر سوچتا وہ کیسی تنہائی جھیل رہی ہے۔ اسے کیا غم ہے؟ میرے ساتھ اس کا ایک بے معنی رابطہ ہے اس سے اُسے کیا حاصل۔۔۔؟"

ایک روز گفتگو کے دوران میں نے اُسے کہا۔

"یہ تمہارا Mobile Network بہت مہنگا ہے۔۔۔"

"سر۔۔۔ پیسہ دراصل ہمارا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ میرے پانچ بھائی ہیں، ہر سال کار کا ماڈل بدل لیتے ہیں۔ دولت کی فراوانی ہے، بزنس کے سلسلے میں بھائی شہر سے باہر رہتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں آپ کے موبائل نیٹ ورک پر Switch Over کر لیتی ہوں۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ ضروری تو نہیں۔"

"سر۔۔۔ آپ کی خاطر طعنے بھی سہہ لیں گے۔"

''میں سمجھا نہیں۔۔۔!''

''سر۔۔۔ یہ جو موبائل نیٹ ورک ہے نا، یہ بھی Status Symbol ہو گیا ہے ہمارے پورے خاندان میں کسی کے پاس بھی آپ والے موبائل نیٹ ورک کی Sim نہیں جب میں Switch Over کروں گی تو سب کو اچنبھا ہوگا۔ کزنز قہقہے لگائیں گے۔۔۔ بے چاری غریب ہو گئی ہے۔۔۔کوئی کہے گا کنجوسی کی حد ہوتی ہے۔ وہ کسی ملاقات پر اپنے Network کی خوبیوں میں اتنے دلائل دیں گے۔ ہلاّ گلاّ مچائیں گے کہ شور سے چھت اُڑ جائے گی۔۔۔لیکن۔۔۔ سر۔۔۔کل سے میں آپ کے لیے Sim بدل لوں گی۔''

''پاگل نہ بنو۔۔۔رہنے دو۔۔۔''

''نہیں سر۔۔۔'' دِل کی عدالت میں بیٹھا جج فیصلہ سنا کر سائیڈ روم میں جا چکا ہے اگلے روز اس نے نئی Sim سے مجھے کال کیا۔

''سر۔۔۔آپ کا نمبر بھی Favourite کرالیا ہے۔ رات گیارہ بجے آپ سے تفصیلی بات کروں گی۔۔۔آپ کے پاس وقت ہوگا۔۔۔نا۔''

وقت کے ہی تو ہم اسیر ہیں۔

گرمیوں کی رات تھی آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ ویسے ہی تھے جیسے بچپن میں دادی ماں سے کہانی سنتے سمے ہوا کرتے تھے۔ سات ستاروں کا جھرمٹ جسے دادی ماں ''ترنگڑ'' کا نام دیا کرتی تھیں۔ ''ترنگڑ'' جس میں بھوسہ ڈال کر اونٹوں پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے۔ ستارے جن سے پہلے زمانوں میں لوگ سمت نما کا کام لیتے اور راستے طے کرنے میں آسانی رہتی۔ میں اپنے بچپن سے محوِکلام تھا کہ موبائل کی مخصوص آواز نے متوجہ کیا۔

''سر۔۔۔آپ ٹھیک ہیں۔''

''اللہ کا کرم ہے۔''

''سر۔۔۔ایک بات کہوں۔۔۔؟''

''کہیے۔۔۔!''

''آپ اپنے طور پر مجھے Call یا SMS کیوں نہیں کرتے۔''

''اچھا نہیں لگتا۔''

''میں سمجھی نہیں۔۔۔''

''تمہارے ماحول کا تقاضا ہے کہ تمہاری تکریم کا خیال رکھا جائے۔''

''سر۔۔۔! میں اتنی اچھی نہیں ہوں، میرا اتنا خیال نہ رکھا کریں۔ میں کیسے کہوں ایک خیال رکھنے والا تھا، وہ خواب ہوا۔۔۔!''

''کون۔۔۔؟''

''سر۔۔۔وہ جو۔۔۔ میرا نہیں تھا۔ سہ پہر کی چائے پر اپنا ادھورا کپ چائے کا چھوڑ گیا۔۔۔ میری زندگی ادھوری رہ گئی۔ تب سے میری میز پر میری چائے کے ساتھ اس کا آدھا کپ بھی موجود رہتا ہے۔ میں نے کرسی بھی اُس جگہ سے نہیں اُٹھائی جہاں سے وہ اُٹھ کر گیا تھا مبادا کسی لمحے اچانک لوٹے اور کرسی آباد ہو جائے۔۔۔ سر۔۔۔ وہ میرا تھا، میرے وجود کی مہک اور۔۔۔اور۔۔۔!''

سسکیوں میں آواز کی تار ٹوٹ گئی۔

''سر۔۔۔کہا تھا۔۔۔ نا کہ ہماری حویلی کی دیواریں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ ہم گھر سے نکلتی ہیں تو کار تک نوکر پُشت کیے چادریں تانے کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم چادروں میں لپٹی کار میں بیٹھتی ہیں۔ کار کے شیشوں پر پردے لگے ہیں۔ فرنٹ اور بیک سیٹ کے درمیان بھی پردہ لگایا

گیا ہے تاکہ آئینے میں ڈرائیور عکس نہ دیکھ لے۔۔۔ سر۔۔۔ دم گھٹتا ہے میرا۔ لگتا ہے کسی اندھے کنویں میں قید کردی گئی ہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی جس میں انسان اپنی مرضی سے سانس بھی نہ لے سکے۔ کالج لائف میں دونوکرانیاں مسلسل نگرانی پر مامور رہیں۔۔۔ ناک اتنی اُونچی ہے کہ کوئی لڑکا میرے والدین کی نظر میں جچتا ہی نہیں اور وہ جو آدھا کپ چائے چھوڑ گیا تھا۔ اس کی جائیداد کم تھی۔''

''آدھے کپ والا گیا کہاں۔۔۔؟''

''سر۔۔۔ کہیں نہیں گیا، وہ جا بھی کہاں سکتا ہے میرے دل میں بیٹھا ہے۔ باتیں کرتا ہے ہنستا ہے، روتا ہے، ناراض ہوتا ہے، روٹھ جاتا ہے، منا لیتی ہوں میں اُسے۔۔۔ کاش سر۔۔۔! جیسے اُسے میرے گھر سے نکالا گیا دِل سے بھی نکال دیا جاتا تو چین سے جی لیتی سر۔۔۔! یہ جو دِل کے مکین ہوتے ہیں یہ دِل کی ریاست سے کیوں نہیں نکلتے۔۔۔ سر۔۔۔! آپ میری باتوں سے اُکتا تو نہیں گئے۔۔۔؟''

اس کی آواز میں نمی تھی۔ میں اس کی گفتگو انہماک سے سن رہا تھا شاید وہ اپنی تنہائی کا صحرا پاٹنا چاہتی تھی۔

''سر۔۔۔ آپ چپ کیوں ہیں۔۔۔؟''

''تمہاری گفتگو کا تاگہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔۔۔ تم کہو، میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''سر۔۔۔! آپ نے آج تک مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا۔''

''بے نام رشتے کو بے نام ہی سفر طے کرنے دو۔۔۔!''

''ہاں۔۔۔ سر!۔۔۔ میں کہہ رہی تھی۔ گھر کیا ہے؟ مغلیہ عہد کی حویلی ہے۔ باہر ڈیرے پر میلہ لگا رہتا ہے۔ میرے والد جاگیردار ہیں اور پیر بھی۔۔۔! بھائیوں کو سیاست کا چسکہ ہے۔

مجرا بھی معمول کی بات ہے۔ میری کُل کائنات میرا کمرہ ہے۔ کمرے میں ہلکا آسمانی پینٹ ہے، پردوں کا رنگ میچنگ ہے دیوار پر صادقین کی پینٹنگ کے ساتھ تاج محل کی ایک Oil Painting ہے جو ایک سہیلی نے تحفہ میں دی تھی۔ کلاسیکی موسیقی کی CD's ہیں، سامنے الماری میں پندرہ بیس انگریزی ناول اور اُردو فکشن جو میرا درد بانٹتے ہیں۔۔۔ سر میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے۔۔۔"

"کہو۔۔۔!"

"آپ سے ایک ملاقات کی خواہش۔۔۔ صوبہ پنجاب میں ہوتی تو شاید آسان ہوتا لیکن سر!۔۔۔ کہاں آسان ہونا تھا، دیواریں، آسمان، بلندی، بندشیں، چھوڑیے سر!۔۔۔ کوئی خواہش نہیں پالنا اب مجھے۔۔۔ آدھا کپ چائے ہی کافی ہے۔"

باتیں کرتے کرتے وہ چپ ہوگئی، میں سمجھا کال کٹ گئی ہے۔۔۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو۔"

"جی۔۔۔ سر۔۔۔!"

"چپ کیوں اُتر آئی ہے۔۔۔؟"

"سر۔۔۔ میرے گاؤں کا رستہ کٹھن ہے۔ خواہش کا کیا ہے، منہ زور ہے زیادہ سے زیادہ پچھاڑ کھائے گی نا۔۔۔ پہلے ہی وجود ادھورا ہے۔ آپ میرے شہر کا نام ذہن میں محفوظ کر لیجیے شاید کبھی وقت کی اینٹ سرک جائے اور ملاقات کا سامان نکل آئے۔ ایک بڑی شاہراہ سے گزرتے ہوئے آپ کو سائن بورڈ نظر آئے گا جس پر ہماری حویلی کا نام درج ہے۔ شاہراہ چھوڑ کر ذیلی سڑک پر ہو لیجیے گا چند کلومیٹر بعد گھنے درخت آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔ کبھی زندگی میں ایک بار۔۔۔ سر۔۔۔ صرف ایک بار، میرے صوبے سے گزر ہو، گھنے درختوں میں حویلی کے اُونچے

برج ہیں۔ وہاں لوگوں کا تانتا بندھا ہوگا۔ مجھے ایک SMS کر دیجیے گا میرے لیے یہ خوشی بہت ہوگی کہ آپ ایک بار صرف میری خاطر یہاں آئے تھے۔''

وعدہ مشکل تھا۔

کال کٹ گئی۔

دِن پھر اپنے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔

سردیوں کی ایک دوپہر تھی۔

SMS۔۔۔ مختصر سا۔۔۔ سر۔۔۔ ''آپ کے صوبے میں سانس لے رہی ہوں۔''

''کس شہر میں؟''

''لاہور۔۔۔''

''خیریت ہے؟''

''کزن کی شادی میں آئے ہیں۔ سر!۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔ رات میں SMS کروں گی

رات گزر گئی۔ رات میں موبائل Silent Mode پر ہوتا ہے۔ صبح اس کے تین SMS موجود تھے۔

''سر۔۔۔ رات کا کھانا فورٹریس اسٹیڈیم کے ایک ہوٹل میں کھایا۔ بہت اچھا لگا۔''

دوسرا SMS ''سر۔۔۔ فورٹریس اسٹیڈیم کی سیر کے دوران میں ایک بک اسٹال پر رُکی آپ کا افسانوی مجموعہ ''برائے فروخت'' نظر آیا۔۔۔ سر کتنی خوشی ہوئی مت پوچھیے خرید لیا۔''

تیسرا SMS ''رات میں سوئی نہیں۔ ''برائے فروخت'' مکمل پڑھ کے سوئی۔

(۲)

میرے موبائل میں اس کے چند SMS محفوظ ہیں جو میں نے Delete نہیں کیے۔۔۔

کیوں Delete نہیں کیے اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے بہت سارے سوال ساری عمر لاینحل رہتے ہیں۔ میں SMS ترتیب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

''کسی کو پلکوں میں نہ بساؤ۔ پلکوں میں صرف سپنے بستے ہیں اگر بسانا ہے تو دِل میں بساؤ کیوں کہ دِل میں صرف اپنے بستے ہیں۔''

یوں راتوں کو نہ جاگو سولیا کرو
یوں دِل میں آنسو نہ روکو رولیا کرو

''سر!۔۔۔ کیسے ہیں۔ اُمید ہے ٹھیک ہوں گے کبھی کبھی تنہائی اور اُداسی کا کوئی علاج نہیں ہوتا

''پھر چاند کِھلا پھر رات ہوئی
پھر دِل نے کہا ہے تیری کمی
پھر یاد کے جھونکے مہک گئے
پھر پاگل ارماں بہک گئے
پھر گزرے لمحوں کی باتیں
پھر جاگی جاگی سی راتیں
پھر ٹھہر گئی پلکوں پہ نمی

پھر دِل نے کہا ہے تیری کمی۔۔۔ سر۔۔۔ خبر نہیں کس چیز کی کمی ہے سمجھ نہیں آتی۔۔۔ اپنا خیال رکھیئے گا۔۔۔''

نہ ملتا نقدِ جاں دے کر بھی ہم کو
گراں تھا اس قدر سودا کہ ہم بازار چھوڑ آئے

کوئی آئینہ رکھ ایسا کہ خود بھی دکھائی دے جس میں
ضروری ہوتی ہے خود سے بھی ملاقات کبھی کبھی

حیرت تو یہ ہے کہ بخیہ گروں کے ہجوم میں
اک نامراد زخم ہے جو سِل نہیں رہا

موبائل OFF رکھنا میرے مزاج کا حصہ نہیں۔ جیسے شروع میں کہا کہ رات میں Silent Mode پر ہوتا ہے۔ ایک بار بخار کے دوران میں نے موبائل OFF کر کے رکھ دیا۔ جس روز موبائل ON کیا۔۔۔اس کا SMS اس کی تڑپ کی گواہی دے رہا تھا۔

''سر!۔۔۔ Thats not fair میں بہت ڈر گئی تھی آپ کا نمبر کیوں بند تھا۔ بہت ڈر لگا مجھے بس ایسا نہ کیا کریں۔ OK اپنا خیال رکھیے گا شب بخیر۔۔۔اللہ حافظ۔''

زندگی رواں ہے۔ ہم زمین پر اپنے حصے کا سفر مکمل کر کے سو جائیں گے تو بھی یہ رواں ہوگی۔ میرے من میں تھا کہ کسی روز اس شخص کا پتا معلوم کرنا ہے جو میز پر آدھا کپ چائے چھوڑ گیا اور کرسی جس کے انتظار میں نہیں اُٹھائی گئی۔ جب بھی اِس کی تفصیل معلوم کرنے کو بات کی وہ طرح دے جاتی۔۔۔

''سر۔۔۔آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے نا۔۔۔''

''کیسے سمجھنے کی کوشش کروں؟''

''سر۔۔۔ جو زندگی سے نکل گیا، من کی تلاش سے واپس تو نہیں آئے گا۔'' وہ اپنے دُکھ۔۔۔سکھ میرے ساتھ بانٹتی۔۔۔الگنی پر ڈالے گئے کپڑوں تک کا ذکر کرتی۔ کوئی نئی کتاب، تازہ میوزک کی CD۔۔۔اس نے اپنی زندگی کے سارے ورق مجھے سنائے۔۔۔میرے دِل

کے Rack میں اِس کی کتاب زیست محفوظ ہے۔

(۳)

ارادہ باندھا نہ خیال تھا کہ کبھی اس کے شہر کا سفر درپیش ہوگا۔

لیکن ایک دِن پاؤں میں سفر باندھے انھی راہوں سے گزرنا تھا جہاں وہ رہتی تھی۔ اسے Surprize دینا چاہتا تھا لیکن پھر خیال آیا اگر اس روز وہ گھر پر موجود نہ ہوئی تو اُسے دُکھ ہوگا۔۔۔

میں نے اُسے SMS کیا۔

''سر۔۔۔ناممکن۔۔۔میں نہیں مانتی، کب۔۔۔؟ کس وقت۔۔۔؟''

''ساون کی ایک سہ پہر میں تیرے دیس سے گزروں گا۔ حویلی کے باہر جو ڈیرہ ہے وہاں اُتروں گا۔ درختوں کے درمیان پانی کے جو مٹکے رکھے ہیں، مٹی کے کٹورے میں پانی پیوں گا پھر بڑی شاہراہ سے ہوتا ہوا زندگی کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں گا۔''

''سر۔۔۔آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟''

''کیا تیرا میرا مذاق چلتا ہے۔''

ساون کی سہ پہر کون سی اتنی مسافت پر تھی۔ بڑی شاہراہ سے گاڑی میں نے اسی راستے پر ڈال دی جو اس نے سمجھایا تھا، تارکول کی سڑک، کہیں کہیں اونٹوں کے قافلے، سرکنڈوں کے درمیان چرتی بکریوں کے ریوڑ۔۔۔ جب میں حویلی کی جانب مڑا، سامنے کشادہ اور وسیع ڈیرہ تھا۔ گھنے درختوں کے نیچے دیوہیکل پایوں والی چارپائیاں بچھی تھیں۔ مٹکے رکھے تھے اور ان پر مٹی کے کٹورے دھرے تھے۔ چارپائی پر بیٹھے ایک شخص نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور آمد کا مقصد پوچھا۔۔۔

''پیر نواب صاحب کی ملاقات کو آیا ہوں۔''

انہوں نے چارپائی کے سرہانے منقش جھالردار تکیے رکھے۔ میں نے مٹی کے کٹورے میں پانی پینے کی خواہش ظاہر کی۔۔۔

''نواب صاحب کے باہر آنے کا وقت ہے۔۔۔'' ایک خشخشی داڑھی والا جس نے سر پر پگڑی جما رکھی تھی۔۔۔کہا

ابھی کٹورا میں نے منہ سے لگایا تھا کہ ملازمین میں ہلچل مچی اور پوری فضا مؤدب ہوگئی۔ درمیانے قد کا ایک شخص، کاٹن کا کڑکڑاتا سوٹ زیب تن کیے، مونچھیں ترشی ہوئی بال گھنگھریالے پیچھے کی جانب پھینکے ہوئے، پاؤں میں نفیس چپل چمڑے کی، سونے کی انگوٹھیاں دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں میں۔۔۔

میں نے اُٹھ کر اُن سے معانقہ کیا۔

''آپ کا تعارف۔۔۔؟''

''ایک مسافر، سیاح۔۔۔ بڑی شاہراہ سے گزرتے ہوئے آپ کی ریاست کا بورڈ پڑھا ہم آبلہ پا، صحرا نورد یونہی پاؤں میں سفر باندھے گھومتے رہتے ہیں۔ کہیں کوئی منظر روک لے تو لمحہ بھر کو سانس لینے کو رُک جاتے ہیں۔''

وہ زیرلب مسکرائے۔

''پڑھے لکھے لگتے ہو۔۔۔ گفتگو کا سلیقہ بھی ہے۔ یونیورسٹی کے زمانے میں ہم نے بھی کئی شوق پال رکھے تھے۔ کتابوں کا شوق بھی رہا اب کتابوں کی جگہ گھوڑوں اور سیاست نے لے لی ہے۔ کتنی دیر رُکنا ہے آپ نے۔۔۔؟''

''نواب صاحب۔۔۔ سفر طویل ہے۔۔۔ چند ثانیے۔۔۔!''

''ایک کپ چائے ہوجائے مہمان نوازی ہماری روایت اور پہچان ہے۔''

"جی ۔۔۔انکار کی جرأت کہاں سے لائی جائے۔"

"خوب خوب ۔۔۔!"

میں نے ان کے ساتھ اس آہنی گیٹ کی طرف قدم بڑھائے جس کے دونوں پٹ سیاہ بھاری گولڈن کنڈے، ساتھ ایک متصل منقش دروازہ، قدیم عہد کی تاریخ کا گواہ"

دروازے میں میری دلچسپی دیکھ کر نواب صاحب نے کہا۔

"منگورہ سے یہ دروازہ ہم مہنگے داموں خرید کر لائے تھے۔"

OOO

نواب صاحب اسی دروازے سے اندر چلے گئے۔ وہ میری محبت نہیں تھی پھر بھی عجیب سی بے چینی تھی ۔۔۔ ایک نوکر نے سرگوشی کی۔

"آپ خوش قسمت ہیں۔"

"کیسے؟"

نواب صاحب کے ڈرائنگ روم میں منسٹرز اور قریبی دوستوں کے علاوہ اور کوئی داخل نہیں ہوتا ۔۔۔

جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا مجھے سکتہ ہو گیا۔ دیوار پر چیتے کی کھال، دائیں جانب نظر گھومی تو ان کے آباواجداد کی منقش فریموں میں جڑی تصویریں، فرنیچر انتہائی قیمتی، نفیس، شیشے کی ڈائننگ ٹیبل کے گرد چوبیس کرسیاں ۔۔۔

"آپ ہمارے مہمان ہیں گو چند لمحوں کے لیے سہی ہماری کوشش ہو گی یہ لمحے آپ کو یاد رہیں۔ موضوعِ سخن کتابیں تھیں، تاریخ اور سیاست ۔۔۔!"

ایک نوکرانی بے آواز قدموں سے داخل ہوئی اور جوس کے دو گلاس میز پر رکھ کر اسی انداز

میں مؤدبانہ لوٹ گئی۔ اگلے چند لمحوں میں اس نے میز پر فروٹ چن دیے۔ چائے میں پیزا، فروٹ کیک، بسکٹ، سموسے قیمہ والے، آلو کے کٹلس۔۔۔!''

میں اس لمحے ڈرائنگ روم میں موجود نہیں تھا۔ میں کہاں تھا۔۔۔؟ نہیں معلوم۔۔۔ میں لوٹ جانا چاہتا تھا۔ میں کیوں آیا۔۔۔؟ یہاں کیوں گھڑی بھر کو قیام کیا۔۔۔؟ چائے کی پیالی ابھی ہونٹوں کے قریب ہی تھی کہ ایک نوکر رکوع کی حالت میں اندر داخل ہوا اور نواب صاحب کو کسی کی آمد کی اطلاع دی۔۔۔ آنے والا یقیناً اہم تھا کہ نواب صاحب خود چل کر گئے۔۔۔

نوکرانی ظاہر ہوئی۔۔۔

''مالکن پوچھ رہی ہیں خدمت میں کوئی کمی رہ جائے تو معاف کر دیجیے گا۔''

نوکرانی کو کیا معلوم تھا ''کمی کس چیز کی ہے!''

چند لمحات۔۔۔ ثانیے۔۔۔ وقت کی مٹھی سے پھسل کر گرے۔ پھسلتے لمحوں میں خوف تھا اُمید، آس، خواب اور نہ جانے کیا۔۔۔ چند ثانیے۔۔۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔۔۔ پردہ سرکا۔

ایک ثانیہ۔۔۔

صرف ایک ثانیہ۔

ایک جھلک۔۔۔

اس نے ماتھے پر اپنی مرمریں اُنگلیوں کو لے جا کر سلام مکمل کیا۔

اور پھر۔۔۔

اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

ایک ثانیہ۔۔۔!

وہ میری محبت نہیں تھی۔

پھر وہ ایک سکینڈ میرے من میں کیوں ٹھہر گیا۔۔۔؟''کیا محبت کے سوا بھی کوئی رشتہ ایسا ہے کہ ایک لمحہ من میں امر ہو جائے؟''

چائے کب پی کر اُٹھا۔۔۔؟ نواب صاحب سے وقتِ رُخصت ملنے کا انداز کیا تھا؟

''کس کو دیکھا۔۔۔؟ کچھ یاد نہیں۔۔۔ گھنے درخت، مٹکوں پر مٹی کے آب خورے، اُونچے چبوترے پر وہ موروں کا رقص، جنگلے میں پاؤں سمیٹے بیٹھا چیتا۔۔۔!''

بہت حبس تھا جب میں وہاں سے نکلا۔۔۔

وقت کی ہتھیلی پر حالات وواقعات کی ریلوے لائن کی طرح ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی لکیریں ہیں ان میں اس کی شادی کا بھی اندراج ہے۔۔۔اس شادی کے بارے ایک روز اس نے کہا۔

''سر۔۔۔ میں خوش اور مطمئن ہوں لیکن جو خوشی میرے حصہ میں آئی ہے اسے سمجھوتہ کہتے ہیں۔۔۔''

اس کے بعد وقت کی Calculation ڈسٹرب ہے۔۔۔SMS اور کال کی کڑیاں بے ترتیب ہیں۔شادی کے بعد بھی سہ پہر کی چائے اور آدھا کپ چائے جو کوئی بھول گیا تھا موجود تھی۔ میں مطمئن تھا کہ اس نے تنہائی کے اوقات کو ترتیب دے لیا ہے۔۔۔آدھا کپ چائے کی خیر ہے۔۔۔کسی کی یاد کا ایسا لمحہ ہوگا جس نے اُسے جینے کا انداز سکھا دیا۔ بہت مہینے گزر گئے۔۔۔ مجھے یاد رہا نہ اس نے SMS کیا۔۔۔

ایک سرد صبح میں نماز کے لیے جاگا تو اس کا SMS بے چین کر گیا۔

''سر!۔۔۔آج کسی بھی وقت میں آپ کو کال کروں گی۔''

دوپہر میں اس کا فون آیا۔

''سر!۔۔۔آپ کیسے ہیں؟''

''تم کہو۔۔۔''

''سر۔۔۔آپ کی تخلیق ''میّا'' اور ''برائے فروخت'' سامنے میز پر رکھی ہیں ساتھ میں اشفاق احمد کی ''زاویہ'' جمیلہ ہاشمی کا ''دشتِ سُوس'' اور عبداللہ حسین کا ناول ''باگھ'' رکھا ہے۔۔۔ سر۔۔۔آپ نے ''ماں'' کا کینسر جھیلا ہے اور ''برائے فروخت'' میں ایک افسانہ ہے ''جھونکا ہوا کا'' اس میں بھی موت کی Depth ہے۔۔۔سر۔۔۔آپ بڑی ہمت والے ہیں کیسے کیسے درد جھیل جاتے ہیں۔۔۔سر۔۔۔اِن دنوں میں بیمار ہوں۔دُعا کیجیے گا۔۔۔شام میں فون کروں گی اللہ حافظ اپنا خیال رکھیے گا!''

اس کی گفتگو معنی خیز تھی۔دوپہر اور شام کے درمیان صدیاں بچھ گئیں۔۔۔شام میں اُس کا فون آیا۔۔۔

''سر۔۔۔آپ کو یاد ہے نا آپ کے موبائل نیٹ ورک کی Sim میں نے صرف آپ کے لیے لی تھی۔۔۔''

''یاد ہے۔۔۔!''

''بس۔۔۔سر۔۔۔Sim چند دِن کی مہمان ہے۔''

''کیوں۔۔۔؟''

''سر۔۔۔آپ ہمت والے ہیں، آپ سمجھ تو گئے ہوں گے۔۔۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔۔۔''

''سر۔۔۔جھوٹ اور وہ بھی آپ سے؟'' سر۔۔۔یہ تو ممکن نہیں ہے نا۔۔۔بس

ہو گیا۔۔۔کینسر۔۔۔بلڈ کینسر۔''

کیوں، کیسے۔۔۔کب۔۔۔؟ سر۔۔۔ان سوالوں کے جواب تو نہیں ہوتے نا۔۔۔ سر۔۔۔آپ ایک افسانہ اور لکھ ڈالیے میں کسی کے دِل میں نہ سہی آپ کے افسانے میں تو زندہ رہوں گی نا۔۔۔محبت نہ سہی۔۔۔آپ کے اور میرے درمیان ایک رشتہ تو تھا۔۔۔

میری قوتِ گویائی جاتی رہی۔۔۔

دوسرے روز سارا دِن موبائل پناٹا چھایا رہا۔۔۔

سہ پہر میں SMS کی مخصوص آواز سماعت سے ٹکرائی، خوف، اُمید، اندیشے، پسینے میں تربتر میں نے کرسی کی پُشت پر سر ڈال دیا۔

SMS کھولنے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔

کہیں دور سے آواز آئی۔

مرمریں اُنگلیوں نے ماتھے تک سفر طے کر کے سلام مکمل کیا۔

''سر۔۔۔آخری SMS ہے۔۔۔ہمت کیجیے پڑھ لیجیے۔۔۔!''

ایک لمحے کو آس کی ڈوری کا سرا میں نے تھاما۔۔۔شاید اُسے کینسر نہ ہو اس SMS میں اُمید کی قندیل ٹمٹما رہی ہو۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے SMS کھولا۔۔۔ اور دھرتی کے سارے نیٹ ورک جام ہو گئے۔

''سر۔۔۔آپ نے ایک بار ڈرائنگ روم کا پوچھا تھا، ڈرائنگ روم تو
اک گزرگاہ ہے یہاں تو روز بہت سے لوگ آتے ہیں لیکن یاد رکھیے گا کہ
میں صرف ایک ہی شخص سے ملی تھی اور مجھ سے بھی بس ایک ہی شخص ملا تھا
جو آدھا کپ چائے چھوڑ گیا ورنہ لوگ تو بہت آتے ہیں۔۔۔''

☆☆☆

ذہن بازار

اس کی قسمت کی طرح اس کے سائیکل کا ٹائر دفتر سے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں پنکچر ہو گیا۔ قسمت کو کوسنے کے بجائے اس نے صبر سے کام لیا۔

مقدر کے ٹائر میں دُعا کا پنکچر لگا کر وہ زندگی گھسیٹ رہا تھا لیکن سائیکل کے ٹائر کا پنکچر لگوانے کے لیے رقم کا ہونا ضروری تھا۔ اس نے اپنی جیب کا جائزہ لیا۔ کیوں کہ مہینے کی پانچ تاریخ تک اُدھار چکا دینے کے بعد اس کی جیب میں صرف قناعت بچ جاتی تھی۔ یہ دولت بھی نصیب میں نہ ہوتی تو وہ کب کا پاگل ہو چکا ہوتا۔

جیب میں رکھی ریزگاری سمیت اس نے حساب جوڑا۔ سبزی بھی لینا تھی۔ چھوٹی بیٹی کے سلیپر مرمت کی حد سے گزر چکے تھے۔ کھانسی کا شربت لینا بھی ضروری تھا کیوں کہ گزشتہ رات سے اس کا پانچ سالہ بیٹا مسلسل کھانس رہا تھا۔ ڈاکٹر کی فیس بچانے کی غرض سے اس نے اپنے طور پر نسخہ تجویز دے لیا تھا۔ نسخے میں اینٹی بائیوٹک، اینٹی الرجک اور کھانسی کا شربت شامل تھا لیکن اِس وقت سب سے اہم کام سائیکل کا پنکچر لگوانا تھا۔ چند کلومیٹر وہ سائیکل گھسیٹ بھی لیتا لیکن صبح اسے دفتر بھی تو آنا تھا۔ یہ خدشہ بھی اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا کہ ممکن ہے ٹیوب میں پنکچر ایک سے زیادہ ہوں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے۔ آخری حل مسئلے کا اس کے ذہن میں یہی آیا کہ بیوی کا دوپٹہ نہ رنگوایا جائے اور اس رقم سے پنکچر لگوالیا جائے اور بیوی کو سمجھایا جائے کہ سفید رنگ کا دوپٹہ تو ہر سوٹ کے ساتھ میچ کر جاتا ہے۔ خیالات اور تفکرات کی رو میں گھرا، وہ بھرے بازار سے گزر رہا تھا۔ معاشی تفکرات انسان کو گھیر لیں تو اِردگرد کی رونق معدوم ہو جاتی ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ چل رہا ہے یا اپنے وجود کو گھسیٹ رہا ہے۔ بوجھل قدموں کے ساتھ وہ چلتا رہا، اپنے ذہن کے بازار میں۔

ذہن کے بازار میں پریشانیوں کے سوا کوئی اور دُکان نہیں سجی تھی۔ اس نے اپنے طور پر کوشش کی تھی کہ اس کے ذہن میں کچھ دُکانیں سکھ اور آرام کی بھی کھل جائیں لیکن وہ ناکام رہا۔

اچانک اس نے سائیکل کھڑی کی۔

''دھت تیرے کی۔۔۔'' اس نے اپنے آپ کو کوسا۔

اگر ٹائر میں میخ ہوئی تو اب تک وہ گھوم کر پوری ٹیوب کا ستیاناس کر چکی ہوگی۔

سائیکل کھڑی کر کے اس نے پچھلا پہیہ گھمانا اور اسے غور سے دیکھنا شروع کیا آہستہ آہستہ وہ اس سے بھربھری مٹی جھاڑتا رہا۔ میخ کہیں نہیں تھی۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ سائیکلوں کی دُکان بس قریب ہی تھی۔

اس نے مستری سے پنکچر لگانے کو کہا۔

مستری کے آواز دینے پر چھوٹا بھاگ کر آیا اور ٹائر کھولنے لگا۔

بچے کی عمر یہی کوئی بارہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اسے بچے پر بڑا ترس آیا۔ اس نے سوچا وہ چائلڈ لیبر کے حقوق کے لیے کام کرنے والی کسی تنظیم سے رابطہ کرے اور بچے کو مستری کی دُکان اور جھڑکیوں سے نکال کر کسی اسکول میں داخل کرا دے، لیکن وہ صرف سوچ ہی سکتا تھا۔

''باؤجی گرمی کی وجہ سے دو پنکچر اکھڑ گئے ہیں۔''

''لگا دو بیٹا۔۔۔ میں ابھی سودا سلف لے کر آیا۔'' اس کے لہجے میں نرمی اور ملائمت تھی۔

''باؤجی! نئی ٹیوب ڈلوالیں۔ اس میں تو اب پنکچر لگوانے کی گنجائش نہیں رہی۔''

''بیٹا! اب کی بار تو لگا دے۔ اگلی بار ٹیوب بدل لیں گے۔''

سارے کام نمٹا کر شام ڈھلے وہ گھر کو لوٹ رہا تھا۔ جوں جوں گھر قریب آنے لگا اسے پریشانیاں گھیرنے لگیں۔ اسے یوں لگا اس کی بیوی دروازے کی کُنڈی نہیں کھولے گی بلکہ اس کے ذہن میں مسائل کے کوڑا کرکٹ کا ٹوکرا پھینک دے گی۔ وہ اپنی ناکارہ سوچ کے بیلچے سے ذہن میں لگے مسائل کے ڈھیر کو صاف کرنے میں ناکام رہا تھا۔

اس نے دستک دی۔ دروازہ حسبِ معمول اس کی بیوی نے کھولا۔ اس کے ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے تھے۔

''خیر ہو۔۔۔ آج دیر سے آئے ہو۔''

''سائیکل پنکچر ہو گیا تھا۔''

''میرا دوپٹہ رنگوا لائے ہو۔۔۔؟''

''تجھے اپنے دوپٹے کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ سانس تو لینے دے۔''

اس کی بیوی نے آٹا گوندھ کر سائیکل پر سے سبزی کے شاپر اُتارے۔ بچے کی دوائیاں سنبھالیں۔ کالے رنگ کے شاپر میں سے جب سفید دوپٹہ نکالا تو برس پڑی۔ عسرت نے اسے چڑچڑا کر دیا تھا۔ اس کے لہجے میں اکثر تلخی گھلی رہتی تھی۔ چہرے پر جھائیاں اُبھر آئی تھیں۔

''عمر گل گئی میری تیرے ساتھ لیکن ایک دن کا بھی چین نصیب نہیں ہوا۔ خبر ے تمہارے تنگی کب دُور ہو گی؟''

''پنکچر نہ لگواتا کیا؟''

''اُدھار لگوا لینا تھا۔ ہماری تو عمر ہر مہینے اُدھار چکاتے ہی گزر رہی ہے نا!''

''ایسی بھی دوپٹہ رنگوانے کی تجھے کیا ضرورت آن پڑی؟''

''کل میلاد شریف میں جانا ہے مجھے۔''

''یہ تو اور اچھا ہے۔ سفید دوپٹہ پاکیزگی کی علامت ہے۔ سادگی بھی ہے اس میں۔''

''وہاں بیگمات بن ٹھن کے آتی ہیں۔ کاٹن کے میچنگ سوٹ پہن کر اور میں ایسے ہی چلی جاؤں۔ پتا نہیں ہمارا مقدر کب سنورے گا۔؟''

''میری توسن۔۔۔ گرم نہ ہو۔ جس نیک مقصد کے لیے تم سب مل بیٹھتی ہو وہ تو سادگی کا درس دیتا ہے۔ یہ ان بڑے لوگوں کو جا کر سمجھا جن کی بیگمات بن ٹھن کر آتی ہیں۔ پورا میک اَپ کر کے! تلاوت بھی کرتی ہیں، نعت خوانی بھی ہوتی ہے۔ دورد شریف کی محفل کا بھی اہتمام ہوتا ہے لیکن اسلام تو اس کی اجازت نہیں دیتا۔۔۔!''

''مجھے نہیں معلوم۔ اجازت دیتا ہے کہ نہیں دیتا، مجھے دوپٹہ رنگوا دے۔''

''عجیب عورت ہے۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

مت ماری گئی ہے اس کی، اسے اب کیسے سمجھایا جائے۔ اسے معلوم تھا کہ ایسی محفلیں ہر شہر، ہر محلے اور ہر گلی کا معمول تھیں لیکن عملی زندگی بالکل خالی تھی اس کی رُوح کی طرح، ویران اور اُجڑی ہوئی۔ قرآن کو لپیٹ کر طاق میں دھر دیا گیا تھا۔ بس اس کے نیچے سے رُخصتی کے وقت دُلہن کو گزار لیا جاتا۔ اس کی تعلیمات طاقِ نسیاں ہو گئیں۔

اس کی بیوی تھوڑی دیر کُڑھتی رہی اور پھر کھانا اس کے سامنے پروس کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا بھی قصور نہیں تھا فکرِ معاش نے پوری قوم کی سائیکی بدل کر رکھ دی تھی۔ چڑچڑا پن عام ہو گیا تھا۔ فانی بدن کے آرام کا خیال رکھتے رکھتے رُوحیں بنجر ہو چکی تھیں۔ آسائشات اور سہولیات نے انسان کو چُور چُور کر دیا تھا۔

مسائل درندوں کی طرح انسان کو چیر پھاڑ رہے تھے۔

اور کہیں کوئی ایک بھی ایسا متنفس نہیں تھا جو انسان کو ان درندوں کے خونی پنجوں سے چھڑاتا۔ عملی زندگی ویسی رنگین نہیں تھی جیسی میڈیا اور کیبل نیٹ ورک کے سینکڑوں چینلز پر دکھائی جانے لگی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا سوچ رہا تھا۔

اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

کئی دن سے اس کے بیوی بچے کیبل کنکشن لینے پر اصرار کر رہے تھے۔

''ہونہہ۔۔۔کیبل۔۔۔؟'' وہ زیرِلب ہنسا۔

اسے یقین تھا کہ جس روز اس نے یہ کام کر لیا۔ گھر سے نماز رُخصت ہو جائے گی۔ روزہ اُٹھ جائے گا۔ شرم و حیا یوں پرواز کر جائیں گی جیسے رُوح بدن سے نکل کر نہیں لوٹتی۔

تفکرات نے اس کے بدن کی عمارت کو بوسیدہ کر دیا تھا۔ اس کے اعضاء کی اینٹیں کھسکنے لگی

تھیں۔ ایک روز اس کی بیوی نے سوال کیا۔

''آپ کی صحت گرتی جارہی ہے۔۔۔؟''

''عمر نے آخر ڈھلنا ہی ہے۔''

''دفتر میں کوئی پریشانی ہے کیا۔۔۔؟''

''دفتر میں کیا پریشانی ہوسکتی ہے۔ ہماری مثال تو مشین کی چھوٹی بڑی گراریوں کی مانند ہوتی ہے جو گراری خراب ہوئی نکال کر پھینک دی۔ نئی فٹ کی اور مشین رواں ہوگئی۔ اب تو یہ گراری بھی گھس گئی ہے۔ ریٹائرمنٹ قریب ہے۔ یہ گراری اور کتنے دِن چلے گی؟''

''اچھی باتیں سوچتھیں لیکن۔۔۔''

اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''خیر تو ہے۔۔۔؟'' اس کی بیوی کے چہرے کا رنگ میلاد شریف کے دوپٹے کی طرح سفید ہوگیا۔

''کل رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔۔۔ بیٹا ڈارئنگ رُوم میں دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کے ایک دوست نے کہا۔

''یار بڑی روکھی پھیکی اور بے مزہ زندگی ہے تمہاری یہ تو میڈیا کا دور ہے، کیسے دقیانوسی ہو تم بھی کہ ابھی تک کیبل نہیں لگوائی۔۔۔''

وہ بلک کر رو دیا۔۔۔ کاش بیٹے کی بات سننے سے پہلے میرے ربّ نے میری سماعت چھین لی ہوتی۔ ہولناک جنگوں میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کو اپنے پاس بلا رہا ہے مجھے بھی بلوالیا ہوتا۔''

''کیا کہہ دیا کمبخت نے مجھے بتایئے اس کی ہڈیاں توڑ دوں گی۔''

''کہہ رہا تھا۔۔۔بس یار۔۔۔ابا کے مرنے کی دیر ہے فکر نہ کرو پہلا کام یہی کروں گا۔''

چھت میں دراڑ آ گئی، دیوار و دَر زلزلے کی زد میں تھے۔ کھڑکیوں کے پٹ ہولناک ہوا کی سنسناتی آواز میں اپنی آواز کھو بیٹھے تھے۔ گھر کے برتن دیواروں سے جا ٹکرائے۔ پورے گھر کا سامان روئی کے گالوں کی مانند اُڑنے لگا۔

وہ گھٹنوں میں سر دیے سسک رہا تھا۔

رات سرد اور ہڈیوں کے گودے میں اُترتی تھی۔

''ہم نے تو رزقِ حلال سے ان کی پرورش کی تھی۔'' اس کی بیوی کے چہرے کا رنگ لٹھا ہو رہا تھا۔

''یہ ہونا تھا۔۔۔''

''مگر کیوں ہونا تھا؟''

''اگر مگر چھوڑ دو، جس روز تم نے دوپٹے کی رنگائی پر مجھ سے جھگڑا کیا تھا۔ اس دوپٹے سے لے کر تمہارے کاٹن کے اس سوٹ تک جو تم نے پہن رکھا ہے۔ ساری کمائی رشوت کی ہے۔''

☆☆☆

گرمی بہت ہے

کمرے کا درجہ حرارت معتدل تھا۔۔۔

جانے اسے کیوں گرمی کا احساس ہوا اور اس نے اُٹھ کر ایئر کنڈیشنر آن کر دیا۔ بستر پر واپس ٹیک لگا کر اس نے اخبار کی خبر کا بقیہ ٹکڑا اور جس نمبر کے تحت وہ ٹکرا کہیں درمیان والے صفحات میں اشتہاروں کے جنگل میں گم تھا۔۔۔ تلاش کیا اور خبر مکمل پڑھ لینے کے بعد اس نے پھر پہلے صفحے پر نظر ڈالی۔۔۔ پہلا صفحہ جس پر ایک آسمان بھر پھیلا کسی موبائل کمپنی کا اشتہار اور اس کے پہلو میں اونگھتی ہیڈ لائن۔۔۔ اشتہار میں کوئی خاص کشش نہیں تھی۔۔۔ اوراق پلٹتے ہوئے اسے

احساس ہوا کہ ایئر کنڈیشن سے گرم ہوا کا اخراج ہو رہا ہے۔۔۔حالاں کہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔

یہ وہم ہے میرا۔۔۔اس نے اپنے آپ کو تسلی دی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اسے احساس ہوا کہ کمرے میں حبس بتدریج بڑھ رہا ہے۔۔۔اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔اس نے ایئر کنڈیشن کا ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور تھرمواسٹیٹ کو 18 پر سیٹ کیا۔۔۔پلنگ پر پاؤں لٹکائے اس نے تھوڑا انتظار کیا کہ کمرے کا درجۂ حرارت معمول پر آئے تو انگریزی ناول کا مطالعہ شروع کروں۔بستر جس پر وہ برسوں سے سونے کا عادی تھا اسے گرم محسوس ہوا۔۔۔اس نے پھر خیال کو جھٹکا کہ فوم تو گرم ہوتا ہی ہے۔شیشے کے جگ میں سے اس نے ٹھنڈا پانی گلاس میں اُنڈیلا اور غٹاغٹ پی گیا۔۔۔اس کے گلے میں کانٹے بھر گئے تھے اور کانٹوں کی چُبھن کو اس نے ٹھنڈے پانی سے مارنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔وہ اٹھ کر ایئر کنڈیشن کے قریب گیا' ہوا کو چھو کے محسوس کیا۔۔۔ہوا گرم تھی۔۔۔

اسی دوران اس کی بیوی نے پورے بدن کروٹ لی۔کچی نیند ٹوٹنے سے اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے اور خمار تھا۔

''خیریت۔۔!آپ سوئے نہیں۔''

''کمرہ گرم نہیں ہے کیا۔۔۔؟''

''نہیں تو۔۔۔میں پاؤں پر کمبل ڈالے سو رہی ہوں۔''

''میرا دم گُھٹ رہا ہے۔''

''آپ کو وہم کی بیماری ہے لائٹ بند کیجیے اور سونے کی کوشش کریں۔۔۔''اس کی بیوی نے پوری نیند اوڑھ لی۔

وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔بالکنی میں کھڑے ہو کر اس نے آسمان پر آدھے چاند اور

سامنے رات کی تاریکی میں آسیب زدہ فلیٹس کی کئی منزلہ عمارتوں پر ایک نظر ڈالی۔ فلیٹس۔۔۔ اور فلیٹس میں بستے خاندان' کسی کسی کمرے سے جھانکتی روشنی' قریباً ہر فلیٹ میں ایئر کنڈیشن چل رہا تھا اور اس مشینی شور نے حشرات الارض کا شور نگل لیا تھا۔ اس کے اپنے اندر بھی اک شور بپا تھا۔۔۔

یہ فلیٹس میں چلتے ایئر کنڈیشن میرے اندر کے شور کو نگل کیوں نہیں جاتے، اگر میرے من میں شوکتے شور کو راہ نہ ملی تو یہ مجھے نگل کھائے گا۔۔۔ اس شور کا کیا بندوبست کیا جائے۔۔۔؟

کمرے کے اندر حبس تھا۔ باہر بھی موسم میں حدت تھی۔

درد۔۔۔ کرب۔۔۔ بے بسی۔۔۔ گھٹن۔۔۔ آنسو۔۔۔!

رات کا سناٹا اور من میں گڑی یہ دردکنی۔۔۔ کس کے ساتھ اپنا درد جا' بانٹوں۔۔۔؟

نہیں نہیں۔۔۔ یہ میرا درد ہے۔ اسے عام نہیں کرنا۔ خود پینا اور جینا ہے۔

کیا بیوی کو جگا کر ساتھ شامل کرلوں۔۔۔؟

نہیں۔۔۔ چین کی نیند کیوں توڑوں بے چاری کی۔۔۔ سوتی رہے۔

اس نے اپنے وجود کو اپنے ناتواں بازوؤں میں لیا اور فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ رات کے سناٹے میں ایئر کنڈیشنروں کا شور تھا۔ اپنے بازو اس نے اپنے اردگرد اور مضبوطی سے لپیٹے لیکن اپنے آپ کو سنبھال نہ پایا۔۔۔ اور سارے بندھن ٹوٹ گئے۔۔۔ وہ رو دیا۔۔۔

صبح میں اسے بیٹی کا فون آیا تھا۔۔۔

''بابا۔۔۔ جس فلیٹ میں ہم رہتے ہیں۔۔۔ ایئر کنڈیشن نہیں ہے نا۔۔۔ مجھے بہت گرمی لگتی ہے۔۔۔!''

☆☆☆

بے انت صحرا

بستی کی کچی دیواروں پر شام کی لالی اداس لمحے رکھ کے رخصت ہو رہی تھی۔

اس کا گھر بستی کے جنوب مغرب میں واقع تھا۔اس کی بیوی نے چند روز پہلے دیواروں پر نہر سے لائی گئی مٹی سے لیپ کیا تھا۔تازہ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ابھی باقی تھی۔وہ ایک درمیانی عمر کا شخص تھا،جس کے سر پر اگے بال پرندوں کے گھونسلے کی مانند تھے۔شیو اس کی۔۔۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ بڑھی رہتی تھی۔۔۔آپ کہیں گے کہ میں نے یہ کیوں کہا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بڑھی رہتی تھی۔وجہ یہ ہے کہ وہ ایک منتشر الخیال شخص تھا۔اس کے ذہن کی گلیوں میں سارا دن عورتیں اور لڑکیاں چہل قدمی کرتی تھیں،اس کا اظہار وہ بے تکلف دوستوں کی محفل میں کرتا رہتا تھا۔وہ نماز

کا پابند تھا۔اس کے ماتھے پر سجدوں کا گہرا کلیجی نشان اس کی عبادت کی گواہی دیتا تھا۔لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے دماغ کی گلیوں میں عورتیں کیوں چہل قدمی کرتی تھیں۔۔۔؟ گلی میں ایک ایسی لڑکی بھی تھی جس کا بدن وہ رات میں اوڑھ کے سوجاتا۔۔۔اس کے نو بچے تھے کیوں کہ اس کی شادی اس دور میں ہوئی جب ابھی فیملی پلاننگ کا چرچا اتنا نہیں تھا۔وہ کثیر العیال تھا اور اس بات پر مطمئن بھی۔۔۔وہ ایک لڑکی جو اس کے ذہن کی گلی میں رہتی تھی ایسی بے باک نکلی کہ اس کے ذہن سے نکل کر اس کے آنگن میں اتر آئی۔۔۔اس کی بیوی نے کہ کہیں آنگن سے نکل کر وہ محلے میں نہ گھومنے لگے ایک روز ہمت کر کے اس سے کہا۔

''آپ کچھ تو خیال کریں۔۔۔بچے جوان ہیں۔''

''میں تو صرف اس کو دیکھتا ہوں۔کیا اللہ کی بنائی ہوئی چیز کو دیکھنا گناہ ہے۔۔۔؟''

''میں گناہ ثواب کی بات نہیں کر رہی۔رسوائی کا ڈر ہے۔''

''میں تو صرف عشاء کی نماز کے بعد اس کے بھائی کے ساتھ اس کے گھر چلا جاتا ہوں۔ایک کپ چائے پیتا ہوں اور بس۔۔۔''

بیوی جو اپنے خاوند کے بدن سے لے کر اس کے دماغ میں رینگنے والے ننگے کیڑوں تک سے واقف تھی۔اسے اپنے خاوند کی قربت سے گھن آنے لگی۔اسے ایسے محسوس ہوا اس کے بدن کے ساتھ بہت سے غلیظ کیڑے چمٹ گئے ہیں۔وہ کئی بار سوچتی گھر سے چلی جائے۔اس نے میکے جانے کا ارادہ باندھا' کیڑوں سے جان چھڑانے کے لیے خلع کا بھی سوچا لیکن بچے آڑے آئے ان سب کو سنبھالنا اس اکیلی کے بس کا روگ نہیں تھا۔اس نے چپ اوڑھ لی۔وہ اکثر سوچتی یہ کیسا انسان ہے۔پکا نمازی۔تہجد کے وقت اٹھنے والا لیکن یہ اسے عورتوں کی لت کیوں ہے۔کیا کسی عورت کا بدن مجھ سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش ہے۔۔۔سب ایک سی ہوتی ہیں۔یہ مرد

کے دماغ کا خناس ہے۔

میں نے یہ کیوں کہا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی شیو بڑھی رہتی تھی۔

اس نے ایک بار ڈاڑھی رکھ لی اور فیصلہ سنا دیا کہ یہ زندگی بہت مختصر ہے اس لیے ہمیں گناہوں سے بچنا چاہیے اور نیک کام کرنا چاہئیں۔۔۔ چھ ماہ بعد ایک دن محلے والوں نے دیکھا کہ ڈاڑھی کچھ مختصر ہو چلی ہے۔

''بھائی۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا۔۔۔ ڈاڑھی چھوٹی کیسے ہوگئی۔''

''یار! یہ نائی کا قصور ہے۔۔ اس الو کے پٹھے کو میں نے ڈانٹ پلائی ہے۔ خط بناتے ہوئے اس نے میری ڈاڑھی کا خیال نہیں کیا۔۔۔''

ڈاڑھی مختصر ہوتے ہوتے نائی کی اس موٹی مشین کے نیچے آ گئی جہاں بڑھی ہوئی شیو اور ڈاڑھی کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔

''یار۔۔ آج کھجلی ہو رہی ہے۔۔۔'' ایک دن اس نے نائی سے کہا۔

نائی نے استرے میں تازہ بلیڈ ڈالا اور چھلے ہوئے چہرے کے ساتھ جب وہ گھر آیا تو اس کی بیوی کے چہرے پر ناگواری تھی۔ اس کی بیوی کو ایک اُلجھن یہ بھی تھی کہ وہ اتنے بچوں کا باپ ہونے کے باوجود چولہے میں چوکی پر بیٹھا کھانا کھاتے ہوئے اس کے بدن کو غور سے دیکھتا رہتا ہے۔۔۔ کہا ہے نا۔۔۔ اس کی بیوی کو کیڑوں سے گھن آتی تھی۔۔۔

''جب میں تمہاری ہوں تو یہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر میرا جسم کیوں دیکھتے ہو۔''

''بیوی کو دیکھنا ثواب ہے۔''

''ثواب کے اور بھی کام ہیں۔''

بستی کی کچی دیواروں پر شام کی لالی اداس لمحے رکھ کے رخصت ہو رہی تھی۔

وہ گھر سے تہبند باندھے بنیان پہنے گلی میں نکلا تو سامنے کے پختہ مکان کے سامنے سے اس نے چند کاریگر دیکھے جو کندھوں پر تار کے رول لٹکائے ہاتھوں میں اوزار پکڑے مشرقی سمت جا رہے تھے۔اس نے ایک نوجوان سے پوچھا۔۔۔

''یہ کیبل نیٹ ورک والے ہیں نا۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔باقی کام مکمل ہوگیا ہے اب گھر گھر کیبل پہنچا رہے ہیں۔''

''لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔۔۔قیامت قریب آ گئی ہے۔بے حیائی گھر گھر میں گھس چکی ہے۔اب آسمان سے آگ برسنا باقی ہے۔''

''چاچا۔۔۔کیا تو کیبل نہیں لگوائے گا۔۔۔؟''

''نہ پتر،نا۔۔۔یہ شیطانی کام ہے۔''

''چاچا۔۔۔شیطان تو ہمارے دل میں مستقل رہتا ہے۔''

وہ اپنے دل کے شیطان سے بے پروا اسی سمت چلنے لگا جہاں کیبل نیٹ ورک والوں کا دفتر تھا۔۔۔وہاں نوکیلی مونچھوں والا ایک نوجوان عملے کو کیبل لگانے کی ہدایات دے رہا تھا۔نوجوان اوزار اور کیبل سنبھالے کام پر نکل گئے تو وہ اس نوکیلی مونچھوں والے کے ساتھ تنہا رہ گیا۔۔۔ان کے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی۔۔۔شاید دونوں کو بات بڑھانے کے لیے کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔۔۔

''چاچا۔۔۔آپ کے گھر بھی کیبل لگانی ہے نا۔۔۔؟''

''نہ بیٹا۔۔۔نہ۔۔۔میں شیطان کو اپنے گھر نہیں گھسنے دوں گا۔''

''چاچا۔۔۔آپ کو کیبل کے بارے مکمل معلومات نہیں ہیں نا اس لیے آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے بیٹا۔۔۔؟''

''کیبل نیٹ ورک برا نہیں ہے۔اسے استعمال کرنے والے اچھے یا برے ہوتے ہیں۔''

''وہ کیسے۔۔۔؟''

''چاچا۔۔۔ایک چینل ہے جس پر چوبیس گھنٹے تلاوت ہوتی ہے'ایک چینل نعتوں کا ہے 'قرآنی تعلیمات کے ساتھ ساتھ خبروں کے چینل ہیں۔''

''اچھا۔۔۔اس کا مطلب ہے میں بھی کیبل لگوا سکتا ہوں۔''

''چاچا۔۔۔آپ کہیں تو کل لڑکوں کو بھیج دوں۔۔۔؟''

''نہیں بیٹا۔۔۔مجھے سوچنے دے۔''

رات میں وہ اسی ادھیڑ بُن میں رہا کہ کیا کیبل لگوائی جائے یا نہیں۔وہ اپنے آپ سے سوال جواب کرتا رہا۔لیکن کسی حتمی فیصلے پر پہنچنا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔اسی کشمکش میں اسے نیند آ گئی۔۔۔اگلے روز وہ تیار ہو کر گھر سے نکلا، جب کیبل نیٹ ورک کے دفتر پہنچا تو انتیس انچ کے ٹی وی پر ایک رقاصہ اپنے عروج پر تھی۔نوکیلی مونچھوں والے نے فوراً چینل بدلا اور وہ نعتیں سننے لگا۔۔۔دو تین نعتوں کے بعد پندرہ بیس منٹ اس نے تلاوت سنی، پھر خبروں کے چینل غور سے دیکھے۔۔۔جب وہ وہاں سے نکلا تو کیبل لگانے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔۔۔پانچ وقت کے نمازی نے کیبل کیا لگوائی بہت سے کمزور ایمان والوں کو ایک دلیل ہاتھ آ گئی گویا جواز مل گیا۔۔۔اس نے پہلے ہفتہ کے دوران تلاوت، نعتیں اور خبروں کے چینل دیکھنے کے بعد سوچا کہ ہم اچھے یا برے انسان ہوتے ہیں۔کیبل اچھی یا بری نہیں ہوتی۔۔۔وہ محلے میں جگہ جگہ اپنی دلیلوں کی زنبیل لے کر دلیلیں بانٹنے لگا۔اس کے گھر کے ساتھ لکڑی کا ٹال تھا۔لکڑیاں بیچنے والا ایک عمر

رسیدہ شخص تھا۔۔۔

''بھائی۔۔۔تم تو پنج وقتہ نمازی ہو۔۔۔تم نے کیبل کیوں لگوائی۔۔۔؟''اس نے لکڑیاں تولتے ہوئے پوچھا۔

''بزرگو۔۔۔کیبل نے میرا ایمان تازہ کر دیا ہے۔صبح اب تلاوت باقاعدگی سے سنتا ہوں۔نعتیں سننے کے بعد پون گھنٹہ خبریں دیکھتا ہوں۔یہ پرائیویٹ چینل تو سب پول کھول کے رکھ دیتے ہیں۔۔۔اپنے دو چینل تو حکومت نامہ نشر کرتے ہیں۔''

''یہ سارے نیرو ہیں۔۔۔اور چین کی بانسری بجا رہے ہیں۔''

''بزرگو۔۔۔آپ بھی کیبل لگوالو۔۔۔''

''نہ بھائی۔۔۔نہ۔۔۔بے حیائی والے چینل بہت زیادہ ہیں۔''

''تو۔۔۔آپ وہ نہ دیکھنا۔''

''کیسے نہ دیکھوں۔۔۔نفس کا شیطان میں نے مارلیا ہے کیا۔۔۔؟''

وہ وہاں سے اٹھ کر ایک منیاری کی دوکان پر گیا' نائی سے ہوتا ہوا وہ اپنا موٹر سائیکل ٹھیک کرانے کو مستری کے پاس رکا اور ہر جگہ اس کی زبان بے لگام چلتی رہی۔

کسی نے افواہ اُڑادی کہ چاچے کو''کیبلیریا''ہوگیا ہے۔

''ہیں۔۔۔!یہ کون سی بیماری ہے۔''

''یار۔۔۔ترقی یافتہ عہد ہے نئی نئی ایجادات،نئی سے نئی تحقیق اور ایک سے ایک بیماری اُتر رہی ہے۔۔۔''

''تو کیا یہ لاعلاج بیماری ہے۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ابھی تک کینسر کی مانند کیبلیریا کا علاج دریافت نہیں ہوا۔۔۔''

ایک رات اس کی آنکھ کھل گئی۔۔۔اس نے کروٹیں بدل بدل کر نیند لینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔اچانک اسے خیال آیا۔۔۔کیوں نہ کیبل آن کرلوں وہ اپنے کمرے میں اکیلا تھا اس کی بیوی دوسرے کمرے میں بچوں کے ساتھ سو رہی تھی۔اس نے ٹی وی آن کیا اور ریموٹ سنبھال کر چارپائی پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔۔۔رات اس کے وجود میں سے گزرنے لگی۔۔۔اس نے دیکھا خبروں والے چینل بند ہیں۔۔۔بستی میں کیبل نیٹ ورک نے ابھی چند چینل ہی متعارف کرائے تھے۔

ریموٹ کا بٹن اس کی انگلی کے نیچے تھا اور وہ نفس کے پنجے میں۔۔۔!

جو منظر سامنے تھا اسے دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر میں اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں منظر موجود تھا۔۔۔ایک عورت لباس اور بے لباسی کے درمیان اور اس کے پیچھے تھرکتی اس جیسی سینکڑوں لڑکیاں‘ وہ ساری کی ساری لڑکیاں اس کے ذہن میں گھومنے والی لڑکیوں میں بدل گئیں۔اس نے حیرت سے ان ساری عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھا جن کو وہ روز دیکھنے کا عادی تھا۔

ریموٹ کا بٹن اس کی انگلی کے نیچے تھا اور وہ نفس کے پنجے میں۔۔۔!

ایک توانا مرد نے لڑکی کو بازوؤں میں گھما کے ساحل کی گیلی ریت پر پھیلایا اور ہونٹ اس کی گردن پر رکھ دیے۔۔۔

’’لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔۔۔‘‘ اس نے چینل بدلا تو جانوروں کے ایک چینل پر دو جانور۔۔۔جفتی۔۔۔!

اس نے ٹی وی بند کر دیا۔۔۔اپنے آپ کو ٹٹولا تو اس کے جسم پر لمبے لمبے بال تھے۔اس کی جون بدل گئی تھی۔وہ ریچھ تھا، یا کوئی اور جانور۔۔۔۔اس نے پاؤں پر نظر ڈالی۔خوف سے وہ لرز

اٹھا۔۔۔اپنے پاؤں سے نکل کر وہ ذہن کی گلی میں نکلا تو وہاں سارے جانور پنجے گاڑے بیٹھے تھے۔وہ صحن میں نکل آیا۔اس کے منہ سے عجیب وغریب آوازیں برآمد ہونے لگیں۔۔۔

''کیا یہ میں ہوں۔۔۔کون ہے۔۔۔ یہ میں نہیں تو پھر کون ہے۔۔۔؟ میں کہاں گیا۔۔۔کیا مر گیا۔۔۔جو مر گیا تو یہ زندہ کون ہے۔۔۔کیبل۔۔۔نہیں وہ تو انسان دیکھتے ہیں۔کیا کمرے میں لوٹ کے پھر کوئی ایسا چینل تلاش کروں جو مجھے مجھ سے ملا دے۔۔۔لیکن میں کون ہوں۔۔۔؟ میری شناخت کیا ہے۔۔۔؟

ہونہہ۔۔۔شناخت۔۔۔؟ سب بے نشان ہیں۔''

اس کا چہرہ دن بہ دن مرجھاتا چلا گیا۔۔۔لاغر مریض۔۔۔اس کی بیوی نے اسے متعدد ڈاکٹروں کو چیک کرایا' جو بستی کے قریبی شہر میں تھے۔۔۔ بڑے شہر کی اسے سمجھ تھی نہ استطاعت۔۔۔!خاوند کی بجائے اسے نوجانوں کا غم تھا۔۔۔ان کو کیسے پالوں گی۔۔۔!اس کے خاوند کی عادت ہوگئی وہ رات میں الگ سوتا اور ساری رات اپنے پسندیدہ چینل دیکھتا۔ڈیوٹی پر جاتا تو کام کے دوران اس پر کسلمندی چھائی رہتی۔۔۔!

ذہنی خلجان نے اس کے بدن سے گوشت اتار پھینکا اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آنے لگا۔۔۔!ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ اب گناہ کے قریب نہیں پھٹکنا اور باقی کی زندگی ترتیب سے گزارنی ہے۔سب سے پہلے اس نے ذہن کی گلی میں جھانکا۔۔۔اور پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرلیا' گلی میں وہ ساری عورتیں موجود تھیں جن کے ساتھ اس نے سوتے جاگتے' چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے شب بسری کی تھی۔

''آج رات میں کیبل اکھاڑ پھینکوں گا۔۔۔''اس نے اپنے من میں جاری جنگ کو سیز فائر کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔

رات اتری۔۔۔

سب سو چکے تھے۔اس نے ٹی وی کا، ریموٹ اُٹھایا۔۔۔کشمکش۔۔۔اُلجھن۔۔۔بے زاری۔۔۔خوف۔۔۔ثواب۔۔۔گناہ۔۔۔اسے پسینہ آ گیا۔۔۔جنگ زوروں پر تھی۔۔۔ جنگ جو ازل سے جاری ہے۔۔۔کون کہاں مات کھا جائے۔۔۔پیادہ۔۔۔شاہ۔۔۔گھوڑا۔۔۔ وقت کی چالیں۔۔۔

اس نے آخری ہمت باندھی اور دماغ کی بجائے دل سے رجوع۔۔۔!

وہ وقت کے بے انت صحرا میں کھڑا تھا۔

اس نے دل کو آواز دی۔۔۔

گہرا سناٹا تھا۔۔۔

اسے اپنے ہی جملے کی بازگشت سنائی دی۔۔۔!

دل کہاں گیا۔۔۔؟

وقت کے بے انت صحرا میں اس نے دیکھا تو اس کے دل کو مرے ہوئے زمانے گزر چکے تھے۔۔۔۔!

☆☆☆

اعلان

افسانہ اُلجھ گیا ہے۔

میں کئی ماہ سے اس افسانے میں ذہن کھپا رہا ہوں۔ ایک سرا پکڑتا ہوں تو دوسرا ہاتھ سے نکل جاتا ہے پھر مجھے خیال آیا دُنیا میں اتنے بہت سے مسائل اُلجھے ہوئے ہیں اُلجھے ہونے کے باوجود وہ موجود ہیں تو میں نے اگر ایک اُلجھا ہوا افسانہ اپنے قاری کے سامنے رکھ دیا تو کون سی مشکل آن پڑے گی میرا قاری خود ہی مسئلے کو حل کر لے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ دو ایٹمی طاقتیں ابھی تک پاور میں ہونے کے باوجود مل بیٹھ کر اپنے مسائل حل نہیں کر سکیں۔ ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود ڈیڑھ سو سالہ غلامی کے جراثیم حکومتی نسلِ نو کو منتقل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے میں مجھے اپنے افسانے کی پڑی ہے کہ وہ اُلجھ گیا ہے جسے اُلجھے ہوئے ابھی چند ماہ ہوئے ہیں۔ یہ کوئی مسئلہ کشمیر،

فلسطین، گجرات اور وانا تو ہے نہیں جس کے لیے تھنک ٹینک سر جوڑ کر بیٹھیں۔ سیدھا سادا ایک افسانہ ہے۔ اب قاری کو اُلجھاؤ بتا دوں تا کہ ساٹھ کی دہائی کے افسانوں کی طرح وہ بددل ہو کر افسانہ پڑھنا ہی نہ چھوڑ دے اور میری ساری محنت اکارت چلی جائے۔ اس افسانے میں ایک انفرادی قتل کی کہانی ہے، کہیں سے اجتماعی قتل کی لاشیں بھی کسی نے ڈھو کر افسانے میں ان کی اجتماعی قبر بنادی ہے۔ اس میں ایک مزدور کی کہانی ہے جس کی ایک دِن کی مزدوری گم ہوگئی ہے۔ اس افسانے میں اعلان بھی ہو رہے ہیں۔ چھوڑیے ان باتوں کو وقت کی آواز پر کان دھریے۔ پہلے ہی کون سا کم پانی پلوں کے نیچے سے بہہ گیا ہے۔ دیر کی تو باقی زندگی قائم رکھنے کو ہم ایک بوند پانی کو ہی ترس جائیں گے اور انسانی خون سے پیاس تو نہیں بجھتی نا۔۔۔ اور زندہ رہنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔۔۔ اس لیے آپ تھوڑا غور کریں۔۔۔ افسانے پر یا اعلان پر۔۔۔!

معلوم نہیں یہ نئے زمانے کی بات ہے یا پرانے زمانے کی۔ یہ بھی خبر نہیں یہ قصہ کہانی ہے کب کی۔۔۔؟

اعلان ہو رہا تھا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اعلان ڈھنڈورچی ڈھول کی تھاپ پر شہر کی گلیوں میں الاپ رہا تھا۔ کسی مسجد کے اسپیکر سے یہ اعلان کیا جا رہا تھا، یا ریڈیو اور ٹی وی پر نشر کیا جا رہا تھا۔ اعلان کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے بار بار کیوں دہرایا جا رہا ہے۔ بستی والے اعلان غور سے سن رہے تھے۔

ملک میں طاعون کی وبا پھوٹنے والی ہے اور طاعون کے پرندے ہر طرف منڈلا رہے ہیں۔ امکان ہے کہ وہ صرف ظلم وستم روا رکھنے والے افراد کو ہی نشانہ بنائیں گے۔ ان کا ہدف اور کوئی نہیں ہوگا۔ اس لیے عوام اور پُرامن شہریوں کو بالکل گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اعلان میں یہ بھی کہا جا رہا تھا وہ ان پر بھی عذاب بن کر اُتریں گے جو ملک میں بے جا خوف وہراس پھیلاتے ہیں

اور دھماکوں کے ذریعے بے گناہ شہریوں کی نہ صرف نیندیں حرام کرتے ہیں بلکہ ان مظلوموں کے خون پر سیاست کے قصر تعمیر کرتے ہیں۔

بستی والے بھاگ کے گھروں سے اپنے سماعتی آلے اُٹھا لائے۔ وہ اعلان کو واضح اور صاف سننا چاہتے تھے۔ یہ وہم بھی ہوسکتا تھا۔ کچھ یہ بھی سوچ رہے تھے ممکن ہے یہ اعلان خواب میں ہوا اور ابھی ہماری آنکھ کھلے تو ہم صدیوں کے اسی بدنصیب آہنی بستر پر ہی ہوں۔ اعلان کے بعد میڈیا نے خبر دی کہ ملک کے تمام تھانوں اور ہسپتالوں نے حکومت وقت کے سامنے اپنے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ آسمان سے اُترنے والے ہر عذاب کے سامنے اِنسان ازل سے بے بس چلا آ رہا ہے۔ پرندوں کا رُخ مغرب سے مشرق کی سمت تھا۔

ایک اعلان کسی مسجد سے شاید اس لیے بھی ہو رہا ہو کہ ایک قتل نے پوری آبادی میں ہراس پھیلا دیا تھا معاملہ گڈمڈ سا تھا۔ ایک تو اسی روز کا وقوعہ تھا آبادی میں ایک قتل ہو گیا۔ قتل کا خوف تو اپنی جگہ تھا پوری آبادی ہراساں تھی لیکن اسی روز ایک بڑے شہر کی مسجد میں ہونے والے دھماکے میں پچیس نمازیوں کے چیتھڑوں نے پورے ملک کی مساجد کے مستقل نمازیوں میں ایک خوف ایسا کاشت کیا کہ اگلی صبح ان کے بیوی بچوں نے اصرار کیا کہ وہ گھر پر ہی سجدہ ریز ہولیں۔ آبادی، شہر اور ملک بھر کا خوف ایک سا تھا۔ سب بے گناہ مارے گئے تھے۔

اخبارات اور میڈیا پر قتل و غارت کی خبریں معمول کا حصہ ہوگئی تھیں۔ بچے بھی یہ سمجھنے لگے تھے کہ ہماری ویڈیو گیمز کی طرح یہ بھی کوئی کھیل ہے اور جیسے ہم گھر بیٹھے پہلے اسٹیشن پر یہ کھیل کھیلتے ہیں ایسے ہی کچھ بڑے لوگ اپنے پلے اسٹیشن سے روزانہ یہ کھیل کھیلتے ہیں اور دُنیا میں کہیں نہ کہیں سو پچاس لاشوں کا گرنا کھیل کا معمول ہے۔ آلۂ سماعت اپنی اپنی جیب میں واپس ڈال کر اب لوگ سوچ رہے تھے۔ قتل تو صرف ہماری بستی میں ہوا ہے لیکن خوف پورے ملک میں کیوں پھیل

گیا ہے۔ یہ اعلان کس نے کرایا ہے یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا حقیقت میں ایک گھر اُجڑ گیا تھا۔ جیسے زمین پر کمزور ممالک اُجڑ رہے تھے۔ ادھر ترقی یافتہ ممالک میں انتھراکس ڈاک کے لفافوں میں چھپ کر حملہ آور تھا۔ حملہ آور تمام نامعلوم تھے سوائے ایک دو طاقتوں کے۔۔۔! دو طاقتیں ایسی تھیں جنھوں نے بہ بانگِ دہل کمزور ممالک کو کچل دیا تھا۔ کرۂ ارض کے کچھ قلیل لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ یہ ان دو ممالک کی جرأت اور عظمت کی دلیل ہے کہ انہوں نے حملہ پوری دُنیا کو بتا کر کیا اگر وہ بتائے بغیر بھی حملہ کر دکھاتے تو کسی نے ان کا کیا بگاڑ لینا تھا۔ ان کے ساتھ کسی کی دُشمنی کا کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔

ادھر بستی کے مقتول کی کسی سے دُشمنی نہیں تھی۔ وہ ایک متوسط طبقے کا ایسا شخص تھا جو دِن بھر دُنیا کے دھندوں میں کھوئے رہنے کے بعد رات ڈھلے اپنی بیٹھک پر اپنے چند دوستوں سے گپ شپ کر لیا کرتا تھا۔ جس روز نہر کنارے وہ شہر سے گاؤں لوٹ رہا تھا۔ شکر دوپہر تھی ایک ریلوے کراسنگ پر جہاں نزدیک نزدیک آبادی کا نام ونشاں نہیں تھا۔ وہ ریلوے لائن کراس کرنے لگا تو گولی اس کی پشت میں اُتر گئی وہ چکرا کر گرا اور دوسری گولی نامعلوم افراد نے دِل میں تاک کر اُتاری۔ جب پولیس پہنچی موٹر سائیکل غائب تھی۔ تھانے میں جو رپورٹ درج ہوئی اس میں بھی قاتلین نامعلوم تھے۔ یہ واردات بھی انہی وارداتوں میں ڈال دی گئی جو آئے دِن موٹر سائیکلوں کے ڈاکے کے سلسلے کا معمول تھیں۔

حکومت کی طرح تھانے والوں نے بھی بستی والوں سے وعدہ کر لیا کہ قاتلوں کو ہر صورت میں گرفتار کیا جائے گا۔ قتل کو بہت دِن گزر گئے۔ زندگی اپنے معمول پر آ گئی ایک دِن تنہائی میں بیٹھا میں سوچ رہا تھا ہابیل قابیل سے چل نکلنے والا یہ سلسلہ رُکا ہی کہاں ہے۔ نسلِ انسانی کے ساتھ یہ بھی پھیلتا جا رہا ہے۔ کہا۔۔۔نا۔۔۔اب تو انسانی بے حسی سے یہ معمول کا حصہ ہو کر رہ گیا

ہے۔

بستی کے معمولات تو معمول پر آ گئے لیکن اس گھر میں دُکھ ابھی بسیرا کیے ہوئے تھا۔ درختوں کی ٹہنیوں اور آنگن میں درد کی ہوا جھلساتی تھی۔ قتل کا درد اتنی جلدی اِنسانی دماغ سے نہیں نکلتا۔ وہ اندر ہی اندر انسان کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ میں بھی اسی بستی اور دُکھ کا حصہ تھا۔ مجھے وہ شخص یاد آ رہا تھا جس کے قاتلوں کی ابھی تک خبر نہیں تھی۔

سامنے پگڈنڈی پر ایک شخص آ رہا تھا۔۔۔ دھیمی چال چلتا ہوا۔۔۔ آہستہ آہستہ اس کے نقوش واضح ہونے لگے۔ اس کے پاؤں میں گانٹھ لگی چپل، سر پر بوسیدہ میلی سی پگڑی اور بغل میں خالی بوریاں تھیں۔ پرندوں کی جگہ چارپائی پر وہ آ کر بیٹھ گیا۔ کہانیاں پرندے اپنے ساتھ لے اُڑے اور میں رسالے کے اوراق میں سے پرندے تلاش کرنے لگا۔ خزاں کی خاموشی میں اک آواز اُبھری۔

''چار چار روپے۔۔۔ سستیاں لے لو۔ چھابیاں لے لو۔۔۔ چار چار روپے۔''

میرا جی چاہا اُٹھ کر ایک چنگیر لے لوں۔ ممکن ہے چنگیر میں روٹی کی بجائے کوئی کہانی رکھی ہو اور بیچنے والی کی جیب میں رقم کی بجائے بھوک رکھی ہو۔ وہ خزاں رسیدہ چہرے والی ایک پستہ قد عورت تھی۔ اس کے کپڑوں میں جگہ جگہ پیوند لگے تھے۔ وہ گزر گئی۔ میں چنگیر سے کہانی اُٹھا سکا نہ اس کی جیب سے بھوک۔۔۔ دیر تلک اس کی پشت پر لٹکتے جھولے اور سر پر دھری چنگیروں کو دیکھتا رہا، رسالے کے اوراق چپ ہو گئے۔۔۔ گونگے اور بہرے۔۔۔ ان کی قوت گویا کیا ہوئی۔۔۔؟ ان سے نطق کس نے چھین لی۔۔۔؟

یہ آدمی جو میرے سامنے بیٹھا ہے کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟

میرے سامنے بیٹھے شخص کی خواہش تھی کہ میں اس سے باتیں کروں۔

لیکن کون سی۔۔۔؟

حالاتِ حاضرہ، موسم، مہنگائی، بیروزگاری، علاقائی سیاست، جنگ، امن، ایٹم۔۔۔کون سی بات۔۔۔؟ وہ آہستہ سے کھنکارا، گلا صاف کیا، پگڑی سنبھالی، بوریوں کو تھپتھپایا حالانکہ وہ خالی تھیں۔ان میں اناج بھرنے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔

''آپ کیسے ہو۔۔۔؟'' وہ گویا ہوا۔اس کا لہجہ کھردرا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔۔۔الحمدللہ۔''

''قاتل کا کوئی پتہ چلا۔۔۔؟'' وہ اس قتل کی بابت مجھ سے پوچھ رہا تھا جسے لوگ اپنی مصروفیات میں اور خاندان کے افراد فکرِ معاش میں بھول گئے تھے۔میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور کہا ''نہیں۔۔۔!''

''ہائے ہائے کیسے سفاک لوگ تھے، موٹر سائیکل چھین لے جاتے نوجوان کو گولی نہ مارتے۔موٹر سائیکل بھی گئی، جان بھی گئی۔۔۔خان صاحب، ایک بات پوچھوں۔۔۔''

''جی۔۔۔''

''آپ مقتول کو کب سے جانتے ہیں۔۔۔؟''

''اجی۔۔۔ہم ان کے ٹریکٹر پر مزدوری کرتا تھا، مٹی ڈھونے کا کام کرتا تھا، وہ بہت اچھا اِنسان تھا، موٹر سائیکل چھیننے والوں کو کیڑے پڑیں، ان کی لاشیں گل سڑ جائیں۔۔۔

''خان جی، اب بھی مزدوری کا سلسلہ ہے یا نہیں۔۔۔''

میرے سامنے کسی نے تازہ اخبار لا رکھا۔ انتھراکس کی جگہ جراثیمی ہتھیاروں کی خبر گرم تھی۔اخبار کے صفحات دھڑ دھڑ جل رہے تھے۔خبروں نے اخبار کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دِل بھی ادھیڑ دیے تھے۔میں شاید اخبار کی سرخی کے بعد اس کی بغلی خبروں میں جھانکتا لیکن مجھے خیال

آیا میں کسی سے محوِ گفتگو ہوں۔۔۔

''خان جی میں نے مزدوری کا پوچھا تھا۔''

''نہیں جی۔۔۔ بے روزگاری کا عذاب ہے۔ ادھر ٹھیکے دار حرام زادے نے دو مہینے کی مزدوری رُوک رکھا ہے کہتا ہے۔ ابھی پیمنٹ نہیں ہوا ہے۔ جانے اللہ میاں نے ہمیں غریب کیوں بنایا اتنا بہت سارا مخلوق کو امیر بنا رہا تھا ہم کو بھی بنا دیتا تو اس کی خدائی میں کون سا کمی آ جانا تھا۔''

''خان صاحب۔۔۔ اللہ کا شکر ادا کریں اس نے آپ کو امیر نہیں بنایا، امیری بھی عذاب اور امتحان ہے۔'' لیکن جس کے گھر میں بھوک ٹپک رہی ہو اس کے لیے فلسفیانہ باتیں کارِ زیاں ہوتی ہیں اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا ''آج کیسے آئے ہو۔۔۔؟''

''تعویذ لینے آیا ہوں جی۔۔۔ بیوی کا دودھ سوکھ گیا ہے اور بچہ بیمار ہے، ہاتھ بہت تنگ ہے، اب تو کہیں مزدوری بھی نہیں مل رہی ہے۔''

میں اس کے کھردرے اور سخت ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ بیلچے نے اتنی روٹی نہیں کمائی تھی، جتنی ہاتھوں نے گانٹھیں کمالی تھیں۔ کھردرے ہاتھوں پر محنت کی روٹی رقم تھی، لکیروں کی لکڑیاں ہاتھ کے تندور میں سلگ رہی تھیں لیکن بوریاں خالی تھیں، وہ پُرامید تھا کہ بوریاں بھر جائیں گی۔ ''تعویذ'' سے دودھ اُتر آئے گا اور اس کا بچہ کلکاریاں مارنے لگے گا۔ اس کے چہرے پر بچھی جھریوں میں کرختگی عجیب سی تھی۔ شاید اس کے گھر کے مسائل بھی کشمیر اور فلسطین کی طرح تھے۔ اس کے پاس روز جینے اور مرنے کے سوا اور کوئی حل نہیں تھا۔ بات سے بات نکلتی رہی۔۔۔ باتوں کے دوران اچانک اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی وہ مسکرایا اور کہا! ''ایک بات کہوں جی۔

اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو؟ کہو، کہو خان صاحب۔۔۔!''

''وہ جی۔۔۔وہ۔۔۔وہ۔۔۔میری۔۔۔ان کی طرف ایک دیہاڑی نکلتی تھی جی، ساٹھ روپیہ، آپ اگر سفارش کریں نا۔۔تعویذ کے ساتھ اگر ساٹھ روپیہ بھی مل جائے تو۔۔۔؟'' اس وقت تو قتل کا دُکھ بہت گہرا تھا نا۔۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ میں ساٹھ روپیہ مانگوں۔

میں سوچ رہا تھا کہ قاتل کے باپ کو ساٹھ روپے کا کہوں یا نہ کہوں۔ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک گاڑی کی آواز سن کر رُک گیا۔ پولیس وین آ کر رُکی تھانے دار اُترا۔۔۔ اور اس نے مقتول کے باپ کا پوچھا۔

پولیس نے بتایا۔۔۔'' سالانہ بھل صفائی کے لیے بڑی نہر کی بندی کے دوران جب پانی اُترا تو اطلاع ملی کہ ریلوے کراسنگ پر نہر میں موٹر سائیکل پڑا ہے۔ وہ ہم نے قبضے میں لے لیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر وہ موٹر سائیکل چھیننے والا گروہ تھا تو پھر وہ موٹر سائیکل نہر میں کیوں پھینک گئے؟''

مقتول کے باپ کو بیٹے کی یاد نے پھر رلا دیا۔ درختوں کے نیچے کہرام مچ گیا۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے مقتول کا باپ سکتے کی کیفیت میں تھا۔ عورتوں کے بین کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ موٹر سائیکل مل گیا ہے۔ لوگ چاروں اور چلے آ رہے تھے۔ پھر وہی چہ مگوئیاں، وہی قصے، مسجد کے مقتول زندہ ہو گئے۔ انتھراکس کے لفافے کھلنے لگے۔ لوگ اتنی زیادہ تعداد میں جمع ہو گئے کہ آوازوں کی جگہ اب صرف مکھیوں کی بھنبھناہٹ تھی۔ خان صاحب کی دہاڑی بھی اسی شور میں دب گئی۔۔۔کون کیا کہہ رہا تھا۔۔۔؟ ایک شخص قدرے بلند آواز میں بول رہا تھا۔

'' ملک بھر میں ہونے والے دھماکوں کے مجرم آج تک نہیں پکڑے گئے یہ پولیس

ہمارے ایک قتل کا کیا سراغ لگائے گی۔"

"نہیں نہیں موٹر سائیکل مل گیا ہے تو قاتل بھی پکڑے جائیں گے۔"

"وہ تو ضیاء الحق کے جہاز کے ٹکڑے بھی مل گئے تھے۔"

اتنے بڑے مجمعے کو چپ کرانا پولیس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

اچانک کسی نے چیخ کر کہا۔۔۔"چپ۔۔۔! اعلان ہو رہا۔۔۔" مجمع یوں چپ ہوا جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ معلوم نہیں یہ نئے زمانے کی بات ہے یا پرانے زمانے کی۔ یہ بھی خبر نہیں یہ قصہ کہانی ہے کب کی۔۔۔؟ اعلان ہو رہا تھا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اعلان ڈھنڈورچی ڈھول کی تھاپ پر شہر کی گلیوں میں الاپ رہا تھا۔ کسی مسجد کے اسپیکر سے یہ اعلان کیا جا رہا تھا، یا ریڈیو اور ٹی وی پر نشر کیا جا رہا تھا۔ اعلان کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے بار بار کیوں دہرایا جا رہا ہے۔

اعلان سننے کے بعد میں نے سوچا مجھے ضرور بولنا چاہیے۔ میں نے ہاتھ بلند کیا لیکن میری زبان لڑکھڑا گئی۔ میری زبان کو تالا کس نے لگا دیا۔۔۔؟ یہ جو دہاڑی مانگنے آیا تھا۔ جس کے بیلچے نے اتنی روٹی نہیں کمائی تھی، جتنی ہاتھوں نے گانٹھیں کمالی تھیں۔ کھردرے ہاتھوں پر محنت کی روٹی رقم تھی، لکیروں کی لکڑیاں ہاتھ کے تندور میں سلگ رہی تھیں۔ یہ بھی چپ ہے میں بھی چپ ہوں، صرف پولیس وین کے انجن کی آواز ہے اور بس۔۔۔!

سنا ہے پورے کرۂ ارض کی بستیاں صدیوں سے چپ ہیں اور اعلان ہو رہا ہے۔۔۔! اعلان کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے بار بار کیوں دُہرایا جا رہا ہے اور مغربی سمت سے آنے والے طاعونی پرندے پوری زمین پر یاجوج ماجوج کی طرح پھیل گئے ہیں۔ ان کی چونچ میں جوایٹمی، کیمیائی، جراثیمی کنکریاں ہیں وہ اندھی ہیں۔۔۔

☆☆☆

کنجی

سارے گھر میں ڈھنڈیا مچی تھی۔

کنجی کھو جانے سے سارے کام ادھورے پڑے تھے۔

ہر ایک اپنی اپنی ہانک رہا تھا۔ سب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ سارے گھر میں اسے تلاش کیا گیا لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ گھر کا سربراہ سر تھامے بیٹھا تھا۔ ساری عمر سمجھاتے گزر گئی تم سب کی عقل میں بات نہ آئی۔۔۔؟ اس نے رنجیدگی سے کہا:

''بابا۔۔۔ ہم ہر بات کا خیال رکھتے ہیں۔ آپ تو خواہ مخواہ ڈانٹتے رہتے ہیں۔۔۔''

''دیکھ رہی ہو نئی نسل کی زبان ماں باپ کے سامنے بھی قینچی کی طرح چلنے لگی ہے۔۔۔'' وہ بیوی سے مخاطب تھا:

''شرم کرو بے حیاؤ۔۔۔ ماں باپ کے سامنے اونچا بولنے سے اعمال اکارت چلے جاتے

ہیں۔ان کے اعمال ہیں ہی کون سے جو اکارت چلے جائیں گے۔۔۔‘‘اس کا غصہ بدستور قائم تھا۔

’’بابا۔۔۔ہم کیا کریں۔۔۔؟ ہمارے اوپر اتنی پابندیاں ڈال دی ہیں آپ نے، یہ کرو وہ نہ کرو۔ایسا کرو گے تو فلاح پا جاؤ گے۔نہیں کرو گے تو پریشانیاں تمہیں گھیر لیں گی۔۔۔؟‘‘

’’نہیں برداشت ہوتیں ہم سے یہ اتنی بہت سی پابندیاں۔۔۔‘‘

’’بول بول اور اونچا بول۔۔۔‘‘

’’قرآن میں اللہ میاں نے سچ کہا ہے کہ مال و اولاد فتنہ ہیں۔۔۔‘‘

’’کس چکر میں پڑ گئے ہو سارے۔۔۔کوئی کنجی تو تلاش کرو۔۔۔‘‘ان کی ماں بولی۔

کنجی کو گم ہوئے شاید کئی سال گزر گئے تھے۔ان کے چہروں پر گم شدہ کنجی کی ساری کیفیات پینٹ تھیں۔

جس روز سے یہ حادثہ ہوا تھا وہ مسلسل مسائل کا شکار چلے آرہے تھے۔گھر کے جس حصے کی وہ چابی تھی، وہ سالوں سے بند تھا اور ان کو یقین تھا کہ اندر گرد اور موسموں کی دیمک نے ہر چیز کو چاٹ کھایا ہوگا۔

کہانی نے موڑ لیا۔۔۔

بوڑھے کا بڑا بیٹا لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

اس کی بیوی نے اس کے سامنے اورنج جوس کا گلاس رکھا اور پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

’’یہ اباجی تو مستقل دردِ سر ہو گئے ہیں۔۔۔‘‘

’’کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟‘‘اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

’’میں نہیں کر سکتی خدمت۔۔۔الگ سے ملازم رکھ دیں۔‘‘

جوس کا گلاس سامنے رکھا تھا۔

اور اس کے اندر کڑواہٹ گھلی تھی۔اس نے اندر کی کڑواہٹ کم کرنے کے لیے ایک گھونٹ بھرا تو اسے ایسے لگا جوس میں اس کی بیوی نے وہ کرشمہ ملا دیا ہے، جو بچپن میں اس کے گاؤں کا ایک حکیم جانوروں کی پھکی میں ملایا کرتا تھا۔

''حوصلہ رکھا کرو۔۔۔ایک دن ہم پر بھی یہ عمر گزرے گی۔ایسے نہ ہو، اس وقت۔۔۔؟''

''آپ بہت دور کی سوچتے ہیں۔جانے اس عمر تک ہم زندہ بھی رہیں گے یا نہیں جو مسائل سامنے ہوں ان کو حل کرنا چاہیے۔مجھ سے یہ بوڑھے نہیں سنبھالے جاتے۔اوپر سے اس کنجی نے مجھے ہلکان کر رکھا ہے۔جب دیکھو اسی کا تذکرہ۔۔۔!''

''کسی وقت تو یہ مسائل اور شکایات کی پٹاری نہ بھی کھولا کرو۔میری کھوپڑی اُبلنے لگتی ہے، جب دیکھو شکایات کا دفتر کھلا ہے۔اپنے اس شکایات سیل کو کبھی بند بھی کر لیا کرو۔۔۔''

''اچھا چھوڑیں۔۔۔جوس پئیں۔''

''رہنے دو۔۔۔''

کہانی رُک گئی۔

''مسئلے کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔''

اس کے دوستوں کا حلقہ بھی برائے نام تھا۔جس کمیونٹی سے اس کا تعلق تھا اس کے مسائل عجیب و غریب تھے۔

وہ اپنا درد کس کے ساتھ بانٹتا۔۔۔وہ اخبار گھٹنوں پر پھیلائے اپنے آپ سے اُلجھ رہا تھا۔اس کی نظر سامنے کے دروازے پر پڑی۔اس کے والد اسی کی جانب آ رہے تھے۔سامنے مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔وہ اُٹھنے لگا۔

''بیٹا۔۔۔مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔''

وہ طوعاً وکرہاً بیٹھ گیا۔

''بیٹا۔۔۔دیکھو میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا۔کنجی تلاش کرنے کو کہا۔۔۔اگر تم نے اس وقت میری بات مان لی ہوتی تو آج تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔اس ایک کمرے کے کھل جانے سے سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا اب ہم بہو پر بوجھ ہیں اسے کیا پڑی ہے ہماری خدمت کرے یہ فرض تو تمہارا تھا۔''

وہ سر جھکائے بات سن رہا تھا۔

اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

وہ سوچنے لگا واقعی اگر میں نے چابی گم نہ کی ہوتی تو آج حالات کچھ اور ہوتے۔

باپ سے اس کی پریشانی دیکھی نہ گئی۔

''بیٹا۔۔۔دیکھ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ۔ماں باپ اولاد کا برا کبھی نہیں سوچتے۔یہ ازل سے چلا آرہا ہے کہ آٹھ دس بچے ماں باپ پر کبھی بوجھ نہیں ہوتے۔ضعیفی میں ماں باپ ساری اولاد پر بھاری ہو جاتے ہیں۔''

وہ شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔

''بیٹا۔۔۔ہم جا رہے ہیں۔''

''کہاں۔۔۔؟''

''اللہ کے پاس۔۔۔''

''ابا جی آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔؟''

''بیٹا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

''اور یہ لو۔۔۔کنجی۔۔۔۔!''

''یہی ہماری کل میراث ہے۔اب اسے گم نہ کر بیٹھنا۔نہیں تو زمین و آسمان کے سارے دروازے مقفل ہو جائیں گے اور ہمیشہ کے لئے بھٹکنا تمہارا مقدر ہو جائے گا۔۔۔'' بوڑھے باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس نے مُٹھی کھولی۔مٹھی میں نماز رکھی تھی۔

اس کی آنکھ کھلی۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔

اور مسجد سے آواز آرہی تھی۔

حی علی الصلوٰۃ۔۔۔حی علی الفلاح۔۔۔!

☆☆☆

چوب دار

جنبش مکن ۔۔۔ہوشیار باش ۔۔۔نگاہ رُوبرو۔۔۔!

شہنشاہِ معظم تشریف لاتے ہیں ۔۔۔!

اُس نے چاروں اور دیکھا۔خالی محل بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔دُور تلک غلام گردشوں میں بھی کوئی متنفس نہیں تھا۔جب کوئی بھی نہیں ہے تو یہ پکار کیسی ہے۔۔۔؟ کون ہے جس کی آمد کی اطلاع ویران اور سُونے محل میں گردش کر رہی ہے۔میری بینائی کے آئینوں میں کوئی ایسی گرد تو نہیں جم گئی کہ مجھے سب نظر نہیں آرہا اور سارے منظر موجود ہیں۔۔۔

کیا میں ہی تو شہنشاہِ معظم نہیں ۔۔۔؟

نہیں نہیں وہ قہقہہ پھینک کے ہنسا۔بہت دیر اُسے اپنے قہقہے کی آواز سنائی دیتی رہی۔اُس نے اپنے وجود پر ایک نظر ڈالی۔کیا میں زمین کا آخری انسان ہوں۔۔۔؟ کیا میں انسان بھی ہوں

کہ نہیں ۔ یہ جو زمین سے نسلِ آدم معدوم ہو گئی ہے۔۔۔کیا مَیں نے اس نسل کو نابود کر ڈالا ہے۔اربوں انسان کیا اک میرے اشارے پر سُلائے جاتے رہے۔۔۔ اُس نے غور سے دیکھا، زمین کا رنگ سرخ تھا۔

جس زمین پر میں پیدا ہُوا تھا وہ تو خاکستری رنگ کی تھی۔اُس پر نیلے اور سبز رنگ کی بہار اُس کا حُسن تھی۔

یہ زمین۔۔۔ یہ سرخ کیوں ہے۔نہیں نہیں۔۔۔اتنا خون نہیں بہایا گیا۔بھلا ایسا ممکن ہی کہاں ہے۔۔۔؟

میں نے اتنے انسانوں کے قتل کا حکم تو جاری نہیں کیا تھا۔میں نے تو صرف زمین کے کچھ ٹکڑوں پر امن قائم کرنے کے لیے نیزہ بردار، آہن پوش، تلوار بکف بھیجے تھے۔وقت کے ساتھ لوہے کو میں نے اُڑان اس لیے تو نہیں دی تھی کہ وہ بارود برساتا پھرے۔۔۔

جنبش مکن۔۔۔ہوشیار باش۔۔۔نگاہ رُوبرو۔۔۔!

شہنشاہِ معظم تشریف لاتے ہیں۔۔۔!

اُس نے دم سادھ لیا۔اِدھر اُدھر پھر نگاہ ڈالی۔ایک کونے سے اُسے سرسراہٹ سی سنائی دی۔اُس نے نگاہ مرکوز رکھی۔آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔کیا شہنشاہِ معظم سے قبل کوئی دستہ ان کی پذیرائی کو نمودار ہوا چاہتا ہے۔سرسراہٹ جب قریب آئی تو اسے ہیولے سے نظر آئے، شاید محل کی قندیلیں بُجھ گئی تھیں۔اُس نے ہیولوں کو غور سے دیکھا۔وہ انسان ہرگز نہیں تھے۔غلام گردش کے ایک ستون کے پیچھے کھڑا وہ ہیولوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ان سب کے سر نہیں تھے لیکن وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''ہمیں اپنے سر ساتھ لے کے چلنا چاہیے تھا۔''

''کیا فائدہ۔۔۔؟''

''بغیر سر کے ہم کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔''

''اچھا ہے ہم اپنے سر چھوڑ آئے ہیں۔۔۔جس نسلِ انسانی کے دھڑ پر سر تھے، اس کے غلط استعمال سے وہ اندھے فیصلے کرتے چلے گئے اور آخر ان کی نسل معدوم ہوگئی۔اب ایک بھی ''سر'' والا انسان زمین پر نہیں ہے۔''

''کیا ان کی آنکھیں بھی نہیں تھیں۔۔۔؟''

''آنکھیں۔۔۔؟''

آنکھیں خون کے منظر دیکھتے دیکھتے ایک دن خون بن کہ بہہ گئیں۔

چپ چاپ چلتے رہو۔

غلام گردش کے ستون کے پیچھے کھڑے شخص نے اپنا سر ٹٹولا۔ وہ سلامت تھا۔ میں یقینی آخری انسان ہوں۔

جب ہیولے نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اُس نے محل کے اس کمرے کی طرف قدم بڑھائے جو شہنشاہِ معظم کی ذاتی آرام گاہ تھی۔

اوہ۔۔۔میں تو خود شہنشاہِ معظم ہوں۔

میں اس کمرے میں داخل ہو سکتا ہوں۔میری کنیزیں۔۔۔؟ ملکہ۔۔۔؟ سب موجود ہوں گی کیا۔۔۔؟لیکن جو دستہ شورش کے دبانے کو میں نے بھیجا تھا اس کی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی، مجھے تھوڑی دیر آرام کرنا چاہیے لیکن کیا میں سچ مچ زمین پر تنہا رہ گیا ہوں۔۔۔؟ کاش میں نے لاکھوں انسانوں کے قتل کے احکام جاری نہ کیے ہوتے۔۔۔؟

وہ سوچ کی گہری وادی میں وقت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ وقت جس نے اس کے

چیتھڑے اُڑا دیے تھے اور وہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنا بھول گیا تھا۔ جو حکمران وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنا بھول جاتے ہیں وہ اپنی قوم سمیت اندھیروں میں دھکیل دیے جاتے ہیں۔ اسے تو اپنی صدی کا نام بھی بھول گیا تھا کہ میں کس صدی میں فراعین کا نمائندہ رہا۔ اس نے صدیوں کو انگلیوں پر شمار کرنے کی کوشش کی لیکن گنتی بھول گیا۔ اس نے چاروں اور دیکھا، صدیاں الٹی لٹکی ہوئی تھیں۔۔۔

یہ کیا۔۔۔؟

ان صدیوں کو کس نے اُلٹا لٹکا دیا۔

صدیاں تو ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔۔۔

شاید میری کھوپڑی اُلٹ گئی ہے۔

اس نے اپنے سر کو ٹٹولا۔۔۔ سر اسے دھڑ سے بہت بڑا محسوس ہوا۔۔۔

''ہیں۔۔۔؟ یہ میرے سر میں کون سما گیا ہے۔۔۔؟ میرا سر اتنے حجم کا تو نہیں تھا۔۔۔؟''

میں کہاں جاؤں کیا کروں۔۔۔؟ کس کو آواز دوں۔۔۔؟

اس نے اپنی ذاتی آرام گاہ کی طرف قدم بڑھائے لیکن زمین نے اس کے پاؤں میں کیلیں گاڑ دیں۔۔۔

یہ کون سی عبادت گاہ ہے۔۔۔؟ کیا اسے میں نے مسمار کرایا تھا۔ میری آرام گاہ کہاں ہے۔۔۔؟

زمین۔۔۔؟

زمین کو تو میں نے ادھیڑ کر رکھ دیا۔۔۔

اوہ۔۔۔ یہ میرے سر کا حجم جو اتنا بڑھ گیا ہے۔۔۔ یہ وہ عبادت گزار لوگ ہیں جنہیں میں

نے عبادت گاہوں سمیت ابدی نیند سلادیا۔۔۔

یہ مجھے چین نہیں لینے دیں گے۔۔۔

یہ میری روح کی دھجیاں اُڑادیں گے۔

مجھے اپنی آرام گاہ میں پناہ لینا چاہیے۔۔۔!

لیکن میرے چوب دار کہاں ہیں۔۔۔؟

اچھا اچھا۔اپنی زمین کا چوب دار تو میں خود ہوں۔۔۔

لیکن میں اکیلا۔۔۔؟

جب وہ آرام گاہ میں داخل ہوا تو انسانی لاشوں سے آرام گاہ اٹی تھی۔۔۔

تعفن سے اُس کی سانس رک گئی۔وہ پلٹنے کو تھا کہ پھر آواز آئی۔

جنبش مکن۔۔۔ہوشیار باش۔۔۔نگاہ رُوبرو۔۔۔!

شہنشاہِ معظم تشریف لاتے ہیں۔۔۔!

میں ہوں۔میں ہوں۔میں ہوں شہنشاہِ معظم

میں تاریخ ہوں۔میں وقت ہوں۔میں آئینہ ہوں۔۔۔آئینہ۔۔۔؟

یہ آئینے میں اتنی خراشیں۔۔۔یہ کون ہے جس نے تاریخ کو اپنے نوکیلے ناخنوں سے بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔۔۔اس نے زور سے تالی بجائی۔۔۔

مجرموں کو حاضر کیا جائے

وہ خود اپنی عدالت میں کھڑا تھا۔

لاشوں پر پاؤں دھرتا وہ اس الماری کی طرف بڑھا جس میں اس نے آخری معرکے کے دوران اپنے آپ کو سنبھال کے رکھ دیا تھا۔۔۔

یہ میں الماری سے باہر کب آیا۔۔۔؟

ایک دستاویز تھی۔۔۔نا۔جس میں سارے فیصلے درج تھے۔۔۔اس نے الماری کا منقش پٹ کھولا۔۔۔دستاویز موجود تھی لیکن وہ اتنی بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکی تھی کہ اسے کھولنا مشکل تھا۔اس نے ہمت کر کے اسے اٹھایا۔چرمی جلد پر جو نقشہ کھدا ہوا تھا اس میں سرخ لکیریں روشن تھیں۔۔۔!

اندر کہیں نقشے میں اسے ایک کوا نظر آیا۔جو زمین کھود رہا تھا۔زمین کا وہ ٹکڑا اس کی پہچان سے باہر تھا۔کوا مسلسل اپنا کام کیے جا رہا تھا۔اگر یہ ہابیل قابیل کا عہد ہے تو کوے کو ایک قبر کھودنا چاہیے تھی لیکن یہ کیا۔قطار میں بہت سی قبریں کُھدی ہوئی تھیں۔ایک کوا کائیں کائیں کر رہا تھا اور چہار اطراف سے کوے آ کر قبریں کھودنے میں مصروف تھے۔یہ کوؤں نے کس کو دفن کرنا ہے۔اتنی لاشیں کہاں سے لائی جائیں گی۔۔۔؟ زمین پر نسلِ انسانی تو معدوم ہو چکی ہے۔۔۔کیا کوئی پرانا منظر میرے ذہن کے پردے پر تو نہیں چل رہا۔۔۔!

وہی مخلوق جو اس نے محل میں سے گزرتی دیکھی تھی جن کے دھڑ پر سر نہیں تھے وہ لاشیں اٹھائے ان گڑھوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔لاشیں جلی ہوئی اور مسخ شدہ تھیں۔وہ اپنی پہچان کھو چکی تھیں۔ان کو رونے والے بھی رو رو کر اپنی بینائیاں مٹی میں رول چکے تھے اور کوے تھے کہ مسلسل آسمان پر منڈلا رہے تھے۔وہ سارے کالے تھے۔اس نے دور تک نگاہ کی، کوؤں کے علاوہ اسے اور کوئی پرندہ نظر نہیں آیا۔گدھ تو ہونا چاہیے تھے۔یہ اتنے کوے۔۔۔؟ کیسا معمہ ہے۔۔۔؟

وہ ایک پتھریلے ٹیلے پر بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔۔۔!

گدھ ابھی تک نہیں آئے۔۔۔اتنی لاشیں ہم کیسے ٹھکانے لگائیں۔۔۔؟ سردار کوے نے

متفکر ہو کر سوال کیا۔

سردار ہلاکو اور چنگیز خان نے انسانی کھوپڑیوں کے جو مینار تعمیر کیے ہیں گدھ وہاں مصروف ہیں۔کوئی ایک پارٹی تو ادھر آ نکلی ہوتی۔۔۔

کہیں کوئی نہ کوئی طالع آزما اپنی طاقت دکھا رہا ہے کچھ گدھ وہاں مصروف ہیں لیکن گدھ تو لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں تھے۔

سردار انسانی لاشیں بھی تو ان گنت ہیں، ہر درخت کے ساتھ کوئی نہ کوئی درخت کا حصہ بن کے لٹکا ہے کنویں انسانی لاشوں سے اٹے پڑے ہیں۔وہ جو آدھی دنیا فتح کرنے نکلا ہے اس نے کشتوں کے پشتے لگا دیے ہیں۔

دو عظیم جنگوں میں لاکھوں انسانوں کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔دنیا بچانے کا جھانسا دے کر ایک آہن پوش نے ایسے بم گرائے جو لاکھوں انسانوں کو نگل گئے وہاں آج بھی نسلیں اپاہج پیدا ہوتی ہیں، زمین روٹھ گئی ہے۔وہ سبزہ نہیں اگاتی۔وہاں ہر سال درد سر اُٹھاتا ہے جو ہر آنے والی نسل کو رُلاتا ہے۔

یہ انسان بدترین جانور ہے

تو کیا ان جنگوں میں گدھ بھی مارے گئے۔۔۔؟

جی سردار۔۔۔

اس نے خوف سے دوسرا ورق الٹا۔۔۔

اُلٹی لٹکتی صدی اس کے حلق میں مچھلی کا کانٹا بن گئی

یہ کوّے کیسی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔؟

یہ کون سی صدی ہے جس میں لوہے کو میں نے اڑان دی تھی۔۔۔

یہ بارودی پرندے کیوں منڈلا رہے ہیں۔۔۔؟

یہ کیسے تیر ہیں جو آگ اور بارود کی لپک لیے ہزاروں میل لمحوں میں طے کر رہے ہیں۔۔۔؟

کوے باتیں کر رہے تھے۔

وہ باتیں سن رہا تھا۔

ہم پرندوں کی کسی بھی نسل اور قوم نے ایسا خونی کھیل زمین پر نہیں کھیلا۔

وہ اپنے سر کو تھامے سوچ رہا تھا اور۔۔۔ایک کوا اپنے سردار سے پوچھ رہا تھا۔

جب انسان کا وجود ہی مٹ گیا ہے تو پھر ان قبروں میں کسے سلایا جائے گا۔۔۔؟

ایک شخص باقی ہے' ڈر ہے اس سے نسل چل نکلی تو یہ پھر زمین پر لہولہو کھیلیں گے۔ یہ ان کا من بھاتا کھیل ہے۔ قبروں کا تیار رہنا ضروری ہے۔ پہلی قبر بھی ہم نے کھودی تھی، لگتا ہے آخری بھی ہمیں ہی کھودنی پڑے گی۔۔۔

کیا پرندوں اور جانوروں کی ایک کانفرنس نہ بُلا لی جائے۔۔۔؟ سردار کی گرج دار آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کیا۔

وہ کس لیے سردار۔۔۔؟

شیر لاکھوں کروڑوں سال سے جنگل پر حکومت کر رہا ہے۔ اب کسی اور کو بادشاہ کی مسند پر بٹھایا جائے۔

سردار یہ ظلم نہ ڈھائیں۔۔۔!

اس میں ظلم کی کون سی بات ہے۔

سردار ہم نے انسانوں سے یہ سبق سیکھا ہے۔ جب وہ نیا بادشاہ لاتے ہیں تو اکثر پہلے

بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔

توکیا اسی لیے زمین کا رنگ سرخ ہے۔

جی سردار۔۔۔

لیکن شیر کو کیا حق ہے کہ وہ ہم پر حکومت کرے۔۔۔؟

سردار۔۔۔آپ اس منطق میں نہ پڑیں۔

وہ تو ٹھیک ہے۔ اچھا چلو جاؤ۔۔۔اپنا کام کرو، قبریں کھودو۔۔۔!

چرمی دستاویز موجود تھی لیکن وہ اتنی بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکی تھی کہ اسے کھولنا مشکل تھا۔ اس نے ہمت کر کے اسے اٹھایا۔ چرمی جلد پر جو نقشہ کھدا ہوا تھا اس میں سرخ لکیریں روشن تھیں۔۔۔!

توکیا یہ ساری قبریں میرے لیے کھودی جارہی ہیں۔۔۔؟

مجھے کسی اور جزیرے پر نقل مکانی کر لینا چاہیے۔

بوسیدہ اور کرم خوردہ کتاب کے ایک ورق کو اس نے الٹا۔

ساری صدیاں الٹی لٹکی ہوئی تھیں۔ اسے الجھن نے آن گھیرا۔ یہ صدیوں کو کس نے وقت کی سولی پر الٹا لٹکا دیا ہے۔

اُلٹی لٹکتی صدیوں کی تاریخ پڑھنا اتنا آسان نہ تھا۔ اس نے چند لاشیں گھسیٹ کر ایک طرف کیں اور اپنے بیٹھنے کی جگہ بنائی اور تاریخ میں سے وہ منظر تلاش کرنے لگا جن میں کوئی پگڈنڈی سرخ رنگ سے نہ بنائی گئی ہو۔ ایسے منظر اسے نظر ضرور آئے لیکن متقابل لکیریں جو سرخ رنگ سے کھینچی گئی تھیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ زمین پر ہر صدی میں کوئی نہ کوئی خطہ ایسا تھا جہاں خون کا کھیل کھیلا جاتا رہا، اسے اپنی پہچان ہو جاتی تو پھر وہ سارے ٹکڑے ملا کر کوئی نتیجہ نکال لیتا۔ وہ خود بھی تو اپنی پہچان کھو بیٹھا تھا۔ ایک تازہ لہو سے تر بتر صفحہ اس نے کھولا۔۔۔

خون اتنا تھا کہ صدی کو وہ پہچان نہ پایا۔

صفحے کی ہیئت ہی عجیب سی تھی۔اس پر جو تصویریں نمایاں تھیں ان میں ایک انسان قینچی سے درختوں کے سبز پتے کاٹتا چلا جا رہا تھا۔آکسیجن کی کمی سے اس کا دم گھٹنے لگا‘ لیکن وہ تصاویر کو غور سے دیکھتا رہا۔لوگ بارود بیچتے پھر رہے تھے۔بازاروں میں بارود کی دکانیں سجی تھیں۔ایسے ایسے ہتھیار رکھے تھے کہ وہ مبہوط کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔بازار کے آخری سرے پر جب وہ پہنچا تو سامنے تا حدِ نظر میدان تھا۔میدان میں لاکھوں جہاز کھڑے تھے جیسے بچوں کے کھلونوں کی دکان سجائی گئی ہو۔

اس نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ اس شہرِ بارود میں گھوم کے دیکھا جائے۔ایسا بارود جو زمین سے آکسیجن کھینچ لے۔سانس لینے والے مر جائیں لیکن سامان کا نقصان نہ ہو ۔۔۔وہ چلتا رہا۔۔۔ایک عجیب الخلقت مخلوق جو انسان ہرگز نہ تھے اسے ایک سمت جاتے دکھائی دیے۔وہ ان کے پیچھے چلتا رہا۔جانے انہوں نے کتنا سفر طے کیا جب وہ سمندر کنارے پہنچے تو اپنے جیسی مخلوق سے ہاتھ ملایا اور سمندر میں اتر گئے۔سمندر کے سینے پر اس نے دیکھا لوہے کا طویل تختہ بچھا تھا اور اس تختے پر سیکڑوں جنگی جہاز کھڑے تھے۔اس نے سمندر میں پاؤں رکھا، پانی نے اسے رستہ دیا، پانی میں تا حد نظر بارودی جہاز اور وہی مخلوق بارود سے لیس گھوم رہی تھی۔۔۔

لگتا تھا خشکی اور تری پر صرف انہی کی حکومت ہے

جنبش مکن۔۔۔کسی نے اسے آواز دی

زمین نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے

یہ ہم ہیں۔۔۔کمزور اقوام کی لاشوں سے ناشتہ ہمارا مرغوب مشغلہ ہے

اس نے سوال کیا

اتنے جہاز۔۔۔؟ اتنا بارود۔۔۔؟

تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ ہم سے سوال کرو۔۔۔؟

لاکھوں لوگوں پر بارود برسا کر انہیں موت کی نیند سلا دیتے ہو۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے۔۔۔؟

ہاہاہاہا۔۔۔ ظلم۔ ہم انصاف قائم کرتے ہیں تا کہ زمین پر امن ہو

یہ کیسا امن ہے۔۔۔؟

اب زمین پر، پانی ہو کہ خشکی، دریا ہوں کہ پہاڑ صرف ہمارا سِکّہ چلتا ہے۔۔۔

تمہارے سِکّوں کا رنگ سرخ ہے

یہ کون گستاخ ہے۔۔۔؟

اسی زمین کی باقیات سے ہے۔۔۔

ہم نے چپے چپے پر بارود بچھا دیا ہے۔۔۔؟

غلطی سے ایک خطہ رہ گیا ہے

ایک لاکھ جہاز جو بغیر پائلٹ کے پرواز کرتے ہیں فوری روانہ کر دیے جائیں۔

ساری صدیاں الٹی لٹکی ہوئی تھیں۔

اس نے کتاب ایک طرف پھینکی اور گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ ایسی خون آشام کتاب۔۔۔؟

اس نے بارِ دگر اپنے اردگرد ہیولے دیکھے۔ یہ ان ہیولوں سے مختلف تھے جو اس نے غلام گردش سے گزرتے دیکھے تھے۔

ہم سیاہ فام ہیں۔ تم نے ہمارا ورق تو پلٹ کے دیکھا ہوتا کہ ہم پر کیسے کیسے ستم ڈھائے گئے۔ ہم۔۔۔ ہمارا کوئی نام نہیں۔۔۔ جو ہم پہ گزری کیا چشمِ فلک نے ایسا نظارہ دیکھا ہو گا کبھی

نہیں۔۔۔!

ہیولوں میں ایسے بھی تھے جن کے وجود ہڈیوں کا پنجر تھے۔ہم نے اہرامِ مصر تعمیر کیے ہیں۔ہماری کمریں ادھڑ گئی ہیں۔

ہمارا قصور صرف اتنا تھا کہ ہماری زمینوں میں تیل کی نہریں بہتی تھیں۔اب دُور تک دیکھو صرف خون کی نہریں بہتی ہیں۔ایک بوڑھے شخص نے عبا سمیٹتے ہوئے کہا۔۔۔!

وہ اپنی آرام گاہ سے نکل آیا۔۔۔

جنبش مکن۔۔۔ہوشیار باش۔۔۔نگاہ روبرو۔۔۔!

شہنشاہِ معظم تشریف لاتے ہیں۔۔۔!

وہ زمین کی سرحد سے نکل جانا چاہتا تھا۔

جنبش مکن کی آواز اس کی یادداشت پر دستک دے رہی تھی۔اس کے حواس پلٹ رہے تھے۔۔۔اسے وہ لمحہ یاد آیا جب زمین کے کنارے پر کھڑے ہوکر اس نے زمین پر حکومت کرنے کا خواب دیکھا تھا۔انسانوں کو محکوم بنانے کے لیے اس نے اپنی صدیوں کی ایجادات پر ایک نظر ڈالی۔اس نے اپنے ہی ہاتھوں زمین کا رنگ بدل ڈالا تھا۔اب کہیں کوئی متنفس نہ تھا جس پر وہ حکومت کرتا۔

وہ اپنے آپ کو پکارتا پھر رہا تھا۔۔۔

جنبش مکن۔۔۔ہوشیار باش۔۔۔نگاہ روبرو۔۔۔!

شہنشاہِ معظم تشریف لاتے ہیں۔۔۔!

☆☆☆

کنواں، کٹورا اور کوّا

کنویں کی منڈیر پر اس نے کٹورا دھرا اور حوض میں گرتے پانی سے اپنا گھڑا بھرا۔ چند لمحے قبل وہ یہیں موجود تھی میں نے اُسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، جب وہ پہلو سے گھڑا الگ کر کے کٹورا کنویں کی منڈیر پر رکھ رہی تھی۔ میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ نحیف ہونے کے باوجود اس کے چہرے کی اُبھری ہڈیوں سے جوانی جھلک مار رہی تھی۔ گاؤں والے دیکھ رہے تھے کہ وہ کئی روز سے خاموش ہے، گم سم، جیسے کچھ گنوا بیٹھی ہو لیکن اس کی خاموشی ایسی معنی خیز نہ تھی کہ اس پر توجہ مرکوز کی جاتی۔ توجہ کے لیے اس کی جوانی تھی جس پر سب نظر رکھتے تھے چارہ کاٹتے ہوئے، جانوروں کی چرنی میں چارہ ڈالنے کے دوران، نل سے پانی لانے کے اوقات میں، نظروں میں تو وہ

روزانہ تلتی تھی اور یہ پنجاب کے دیہات میں ساید صدیوں سے کلچر کا حصہ ہو چلا تھا۔ وہ برا نہیں مانتی تھی۔ بظاہر اس کی توجہ کا مرکز کوئی نہیں تھا لیکن ہر گھر کی منڈیر پر چہ مگوئیاں رکھی تھیں جن کی بھنبھناہٹ میں اس کا کردار مشکوک تھا۔ وہ خوبصورت ہرگز نہیں لیکن کہنے والے کہتے ہیں اس کی چال اور آواز میں جادو ہے جو پاگل کر دیتا ہے اس کی رو بہ زوال صحت اس کے وجود کو بے نقاب کرتی چلی جارہی تھی۔ کہا ہے نا ابھی وہ ہیں تھی لیکن اب وہ دور دور تک نظر نہیں آ رہی۔ کیا اُسے کوئی بھگا لے گیا۔ کیا اُونچی فصل میں کسی نے اُس کی عزت کاٹ کے پھینک دی؟ نہیں ایسی کوئی ات نہیں وہ بڑے گٹھے ہوئے بدن کی مضبوط اعصاب والی ایک ایسی عورت کی بیٹی ہے جس نے اُسے وڈیروں میں رہ کر جینے کے گُر سکھائے ہیں۔

گھڑا کنویں کی منڈیر پر دھرا ہے اس میں پانی رس رہا ہے۔ خالی کٹورے میں ایک کوا جھانک رہا ہے شاید وہ کچے کھال کے ساتھ کہیں دور نکل گئی ہے اور واپسی کا رستہ بھول گئی ہے۔ عجیب اُلجھی ہوئی کہانی ہے۔ اس کہانی کے سارے کردار کہیں نکل گئے ہیں۔ میں اب کنویں کی منڈیر، گھڑے اور کوے کے ساتھ کہانی کا تانا بانا کیسے بنوں۔۔۔

اس کہانی کا دوسرا کردار کوا ہے۔۔۔نہیں نہیں کوا نہیں، کوے کی عمر تو پانچ سو سال بتائی جاتی ہے۔ ایک وڈیرے کا کردار ہے۔۔۔جس کا من کوے کے رنگ ایسا ہے۔ شاید میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔۔۔ایک نوجوان جو کٹورے والی سے قبل یہاں موجود تھا۔ وڈیرہ تھا نہیں نہیں وڈیرے کا بیٹا تھا شاید وہ اس کا بیٹا نہیں تھا۔ اس نسل کا تسلسل تھا جس کا کوئی نام نہیں۔ اس کے چہرے پر وحشت رینگ رہی تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر خوف میرے وجود میں لرزنے لگا۔ شیو بڑھی ہوئی، ناخن اور ہاتھ میل سے اٹے ہوئے، بال بے ترتیب گرد آلود جیسے گھونسلا اور وہ بھی برباد۔۔۔اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

میری کہانی لکھو۔۔۔لکھو گے کیا۔۔۔؟

نہیں۔۔۔

کیوں۔۔۔؟

بہت سی باتوں کا جواب نہیں ہوتا۔

لیکن تم لکھو۔۔۔ میں مرنے والا ہوں۔۔۔ مرنے سے پہلے مجھے میرا اعمال نامہ لکھ دو

اعمال نامہ لکھنے والے تو پہلے ہی موجود ہیں۔

تم اپنے حصے کا لکھو۔۔۔ مجھے غور سے دیکھو، میں نے اپنی تعلیم برباد کی، جوانی، صحت، خاندانی وقار۔۔۔تم لکھو۔۔۔

یہ کوئی نیا حصہ نہیں۔۔۔ایسی ہزاروں کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔

میری اس سے کوئی ایسی راہ راسم نہ تھی۔ اس کے خاندانی پس نظر کا ذکر بھی عبث ہے وہ کولہو کا بیل ہے۔کولہو کے بیل کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ وہ صرف گھومتا ہے سیدھے سبھاؤ بات اتنی سی ہے یہ ایک محبت کی کتھا ہے۔محبت بھی جسمانی خدوخال کی۔۔۔لیکن میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کسی کو سمجھانا اتنا آسان ہے کیا۔گاؤں میں جو خبر گردش میں تھی وہ اتنی سی تھی کہ وہ اپنے مزارع کی بیٹی کے عشق میں حواس کھو بیٹھا ہے۔گاؤں کا موچی روزانہ تازہ خبر نامہ نشر کرتا۔زیب داستاں کے لیے وہ واقعات میں کتنا مصالحہ ڈالتا کسی کو اس سے غرض نہ تھی وہ چھ بچوں کا باپ تھا،شادی کے آٹھ سال اور چھ بچے۔۔۔!

کب کہاں اور کیسے وہ مزارع کی بیٹی کے بدن کے کنویں میں جا گرا،کسی کو تاریخ کو معلوم نہیں تھی لیکن راوی کا کہنا ہے جب وہ بدن کے کنویں میں گرا تھا گرتے ہی وہ مفلوج ہو گیا۔سارا گاؤں اُسے کنویں سے نکالنے کی تدبیریں کر رہا تھا ہر سو شور بپا تھا۔کوئی رسہ لے کر بھاگا بہت سے

لوگ کنویں میں جھانک کرر ہے تھے شاید وہ سارے اس کنویں میں مفلوج پڑے تھے یا وہ اک شخص؟ رسہ لانے میں دیر ہوگئی اور اُس کی سانس اکھڑنے لگی۔ رسہ لانے والے کہیں راستے میں ہی کھو گئے۔ شاید انہیں اور کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو۔ چہ مگوئیاں گھر کی منڈیروں سے اُتر کر گلیوں میں گھومنے لگیں، موسم گرد آلود ہوگیا۔ سب گرد میں چھپ گئے۔ کسی کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ کنویں کی منڈیر پر ایک گھڑا رکھا ہے جس سے پانی رس رہا ہے اور وہ عورت۔۔۔ وہ لڑکی۔۔۔ نہیں وہ عورت تھی وہ منکوحہ تھی۔ کتنی راتیں اس نے کہاں گزاریں کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔ دو کردار تھے ایک اس کا شوہر جس کی وہ منکوحہ تھی لیکن ابھی رُخصتی نہ ہو پائی تھی اور دوسرا وہ جو اس کے بدن کے کنویں میں گر کر ہاتھ پاؤں تڑوا کر وہیں پر رہا۔ اس نے اس لاش کو گھسیٹ کر باہر پھینکنے کی کوشش کی لیکن ناتوانی آڑے آئی۔ اس نے سوچا کیا کروں؟ اسے بدن میں پڑا رہنے دوں اور وہ جو باہر کھڑا میرے بدن پر دستک دے رہا ہے۔۔۔ کیا اُسے بھی گھسیٹ لوں۔۔۔!''

جیسا کہ میں نے کہا تاریخ معلوم نہیں کہ اُس نے حواس کب کھوئے شاید اُسی روز جب وہ اُس عورت کے کنوارے بدن کی دیوار پھاند کر کنویں میں گرا اور پھر اُسی کنویں کے گدلے اور متعفن پانی میں زندگی گھسیٹنے لگا کیا وہ پاگل تھا، یا پاگل پن کی اداکاری کر رہا تھا۔۔؟ یہ فیصلہ اتنا آسان نہیں۔۔۔ گاؤں میں راہ گیروں سے التجا کرتا۔

مجھے اپنے مزارع کی بیٹی لے دو، میرا نکاح کر دو نہیں تو میں مر جاؤں گا۔ وہ ایک تماشائی بن کر رہ گیا اس کی بیوی اُسے گھر میں باندھ رکھنے کی اپنی سی سعی کرتی لیکن بے کار۔۔۔!''

کہا ہے نا۔۔۔ وہ عورت کچے کھال کے ساتھ کہیں دور نکل گئی ہے۔ کیا کسی وڈیرے نے اُسے منظر سے غائب کر دیا ہے کیوں اُس کچے گھر میں جہاں وہ رہتی تھی اب رات میں صرف کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

موچی شام کے بعد خبر نامہ اپنی زبان کے ساتھ گانٹھ کر نکلتا ہے، جب تک آخری گانٹھ نہ کھلے اس کی زبان کی خارش اُسے بے چین رکھتی ہے۔۔۔اس روز بھی شام سے پہلے وہ کسی کام سے نکلا۔ کنویں کی منڈیر پر کٹورا دھرا تھا اور گھڑے سے پانی رس رہا تھا۔۔۔موچی نے کنویں میں جھانکا اور اُسے آواز دی پھر ایک رسہ پھینک کر کسی نہ کسی طرح اُسے کنارے تک کھینچا۔۔۔!

یہ تم کانپ کیوں رہے ہو۔۔۔؟

''گولی۔۔۔گولی۔۔۔مار دے گا وہ مجھے!''

''کون؟''

وہی جو ایک بار میرے گھر آیا تھا، موٹے جثے والا۔

اس کی سانس پھولی ہوئی تھی، بال بے ترتیب آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے، شیو بڑھی ہوئی، گردن پر میل تہہ در تہہ، ہونٹ پھڑکتے اور لعاب سے لتھڑے ہوئے۔ وہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھا چہار اطراف بٹر بٹر تک رہا تھا جیسے یہ کوئی نئی دُنیا ہے۔

موچی نے کٹورے میں پانی ڈال کر اُسے پکڑایا تو وہ چیخا۔

یہ وہی کٹورا ہے، وہی جب ہم بدن بدن کھیلتے تھک جاتے تھے تو وہ مجھے اس میں دودھ پلاتی تھی۔

موچی نے اپنے کاندھے پر رکھی چادر کو گیلا کیا، پہلے اس کا منہ پونچھا، پھر چہرہ، ہاتھوں پر کنویں کی سیلن اور کائی جمی تھی۔

تم میری ایک بات غور سے سنو۔۔۔

سنوں گا۔۔۔سنوں سنوں گا۔۔۔لیکن تم مجھے کٹورے والی لے دو میں اُس کے بغیر نہیں جی سکتا، وہ میری جند جان ہے۔

ہاں ہاں۔۔۔غم نہ کھالے دوں گا، تیری اماں سے بات کروں گا ہمت تو نہیں پڑتی لیکن کوئی راستہ نکالوں گا بات کرے گا لیکن ایک بات تم سچ سچ بتاؤ کیا تم واقعی پاگل ہو، یا پاگل پن کی اداکاری کر رہے ہو۔

میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔

یہ بتاؤ موٹے جبڑے والا شخص کون ہے؟

اس نے کہا تھا، میں تمہیں گولی مار دوں گا، پنڈلی میں گولی۔۔۔میں چھ مہینے سے جاگ رہا ہوں، سو نہیں سکا۔۔۔وہ رونے لگا۔

رونا چھوڑو۔۔۔حوصلہ کرو یہ یاد کرو وہ تمہیں کیوں گولی مارنا چاہتا تھا۔

اس نے ہماری تصویریں چوری کر لی تھیں۔

کون سی تصویریں۔۔۔؟

"کٹورے والی کے ساتھ کھنچوائی تھیں میں نے۔۔۔ایک روز وہ تصویریں چوری کر لے گیا اور دھمکی دی۔۔۔اوہ۔۔۔کٹورا کہاں گیا۔۔۔میرا کٹورہ!"

کٹورا کہیں نہیں گیا تم بات مکمل کرو۔

میری پنڈلی میں گولی کا نشاں ہے یہ دیکھو۔۔۔اس نے پنڈلی سے شلوار سرکائی۔

ہاں ہاں گولی کا نشاں ہے۔

تم غم نہ کرو۔ موٹے جبڑے والا مجھ سے دبتا ہے۔ میں اُسے سنبھال لوں گا تم قصبے میں تماشا بن کے رہ گئے ہو۔۔۔اپنے بچوں کا خیال کرو۔۔۔کچھ تو سوچو، تمہیں اپنی بیوی کا بھی خیال نہیں۔۔۔سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

نہیں نہیں۔۔۔اوں ہوں۔۔۔بالکل نہیں۔ کٹورے والی نمکین ہے اس کا ذائقہ کرارا

ہے موچی سر، پیٹ کر رہ گیا۔

میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کٹورے والی تجھے مل جائے گی لیکن اداکاری کرنا چھوڑ دے۔

''میں اداکار نہیں ہوں۔۔۔وہ سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی ہیں۔۔۔آہاہاہا۔۔۔!''

چاچا موچی۔۔۔تو نے کٹورے والی دیکھی ہے نا۔۔۔بالکل اداکارہ صائمہ اور انجمن کی طرح ہے!'' یہ لما قد، موٹی اکھ، سوہنڑے رس بھرے ہونٹ!''

اوئے صائمہ کے ماے ایک جھانپڑ دوں گا۔ میری بات کا جواب دے۔

چاچا۔۔۔تو پکا وعدہ کر۔۔۔لے دے گا۔

وہ کنویں کی منڈیر سے اُتر کر چاچے کے قدموں میں آ بیٹھا۔

''دیکھ پتر اس چکر سے باہر نکل آیا۔ کتنی زندگیاں برباد ہو رہی ہیں اک تیری وجہ سے۔۔۔!''

چاچا۔۔۔میری کوئی زندگی نہیں ہے، جو باپ دادا نے بویا وہ کاٹ رہا ہوں۔

وہ سرکتے سرکتے سر کے بل واپس کنویں میں جا گرا۔

موچی نے کنویں میں جھانکا تو خوف سے خون اس کی رگوں میں منجمد ہو گیا۔

اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کنویں کی منڈیر پر کٹورا دھرا تھا، گھڑے سے پانی رس رہا تھا۔۔۔

موچی کو ہوش آیا تو وہ سیلن زدہ کنویں میں پڑا گدلی مٹی چاٹ رہا تھا۔

☆☆☆

کاغذ کی راکھ

''بیٹا۔۔۔! پہچان لیا ہے نا مجھے۔۔۔؟''

''جی انکل؟ بالکل پہچان لیا ہے۔ آپ میرے والد بزرگوار کے دوست ہیں۔''

''بیٹا۔۔۔ دوست نہیں ہمدمِ دیرینہ۔''

''انکل! آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟''

''بیٹا ڈھونڈنے سے اللہ بھی مِل جاتا ہے۔''

''انکل! کیسی گزر رہی ہے؟''

''بیٹا عمر ستّر برس سے متجاوز ہے کیسی گزرنی ہے۔ آج میں تمہارے ساتھ بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ جی بھر کے۔۔۔ بس میں بولتا رہوں تم سنتے رہو۔۔۔ لیکن کیا تمہارے پاس

میری لایعنی گفتگو کے لیے اتنا وقت ہوگا؟''

''انکل! یہ بھی کوئی کہنے والی بات ہے۔''

''بیٹا! میں نے ایک ٹیلی فون کارڈ لیا ہے۔ اِس میں گفتگو کا دورانیہ ایک گھنٹہ بیس منٹ ہے۔ یہ سارا وقت بس تم سے بات کرنا ہے!''

''انکل! آپ باتیں کیجیے۔۔۔ بے دھڑک۔۔۔''

''بیٹا! ہم۔۔۔ عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکے ہیں جہاں صرف سناٹے ہمارا مقدر ہوتے ہیں۔ جسمانی اعضا کی مانند دوست رشتہ دار بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم عضوِ معطل کہاں جا بسیرا کریں؟ اس دھرتی پر ابھی اتنے ادارے بھی تو نہیں کُھلے جہاں ہمیں پھینک دیا جائے لیکن پھینک دینے سے یادیں تو نہیں مرتیں۔ اِنسان کہیں بھی رہ لے یہ ساری عمر پیچھا کرتی ہیں۔ مَیں مرنا چاہتا ہوں۔۔۔ موت کو پکارتا ہوں لیکن موت کہیں اور بہت مصروف ہے۔ ایک بوڑھے شخص کے لیے اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ بیٹا تم اُکتا تو نہیں گئے نا۔۔۔؟''

''انکل! میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''بیٹا۔۔۔! میرا ایک عجیب وغریب مسئلہ ہے کیسے کہوں مجھے کیسی اُلجھن نے گرفتار کر رکھا ہے۔ اُلجھن بھی دیمک ایسی جو میرے وجود کو کھوکھلا کیے دے رہی ہے۔ ہم سن رسیدہ لوگوں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمیں کوئی سننے والا نہیں ہوتا۔ کوئی مل جائے تو ہم اصل موضوع سے ہٹ کر اِدھر اُدھر کی باتیں لے بیٹھتے ہیں اور سامع اُکتا جاتا ہے۔ مجھے تمھاری مصروفیات کا اندازہ ہے لیکن یقین بھی ہے تم میرے مرحوم دوست کے لختِ جگر ہو میری باتیں سن لو گے۔''

''انکل! میں نے ٹیلی ویژن بند کر دیا ہے، کمرے کا دروازہ بھیڑ لیا ہے۔ آپ شرمسار نہ کریں مجھے اس لمحے ضروری کام صرف آپ سے باتیں بانٹنا ہے۔ انکل آپ تنہائی کا ذکر کر رہے

تھے۔''

''بیٹا! تنہائی تو من کی پھانس ہے مجھے جو مسئلہ اندر سے سنگسار کر رہا ہے۔ میں وہ تم سے ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔ شاید تم کوئی راستہ نکال پاؤ۔ جب تک تمہاری چچی زندہ تھی وہ خوش بخت ہر بات سُن لینے کی عادی ہوگئی تھی۔ غم بٹ جاتا تھا جانے اسے جانے کی اتنی جلدی کیوں تھی؟ کچھ دِن رُک گئی ہوتی، میرے بعد رختِ سفر باندھ لیتی لیکن یہ اُس کے بس کا روگ کہاں تھا بھلا۔۔۔ آہ۔۔۔ میں کتنا اکیلا ہوگیا ہوں۔''

''انکل۔۔۔ میں ہوں نا۔۔۔ آپ کا بیٹا۔۔۔ آپ اپنا درد مجھے دے ڈالیے۔''

''بیٹا! یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب میں کالج میں لیکچرر تھا۔ تنخواہ محدود تھی اور اخراجات۔۔۔ بس کیا کہوں؟'' یہ مہنگائی بھی ہر دور میں اپنے مخصوص زاویوں کے ساتھ عفریت بنی پھرتی رہتی ہے۔ عوام اس کے چنگل سے کبھی آزاد نہیں ہوتے۔ گھر بنانے اور سنوارنے کی دُھن میں مَیں قرضہ لینے لگا۔۔۔ دیکھتے دیکھتے پچاس ساٹھ ہزار کا مقروض ہوگیا اور نیند۔۔۔ ہاں بیٹا! نیند خود بھی برباد ہوئی مجھے بھی برباد کرگئی۔ گھر قرض سے چل گیا بن اور سنور گیا لیکن دوسرے دروازے سے سکون نکل گیا۔ میں ننگے پاؤں سکون کے پیچھے بھاگا لیکن بھاگتے بھاگتے ہانپ گیا۔ منہ کے بل گرا، سکون نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔۔۔

''بیٹا۔۔۔! میں ایک گلاس پانی پی لوں؟''

''جی انکل۔۔۔!''

بیٹا۔۔۔! یہ ایک اتوار کے روز کی بات ہے، اتوار ہاں، ہاں بیٹا! اتوار کا دِن تھا چھٹی کا دِن، میں گھر پر تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اپنی چھوٹی سی بیٹھک میں بیٹھا امتحانی پرچوں کے نمبر لگا رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی، باہر نکل کر دیکھا تو ایک نوجوان کھڑا تھا۔ وہ مجھ ہی سے ملنے کو آیا

تھا۔ میں نے اسے بیٹھک میں بٹھایا، چائے پلائی، آمد کا مدعا پوچھا، وہ ایک دور دراز شہر سے آیا تھا۔اس کا پرچہ میرے پاس تھااور وہ گڑگڑا رہا تھا۔

''سر! یہ میرا آخری چانس ہے۔آپ مہربانی کیجیے۔میری زندگی سنور جائے گی۔''

میں کشمکش میں گرفتار تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے اس پر ترس آ گیا۔ پرچہ نکال کر دیکھا تواسے پاس ہونے کے لیےصرف پانچ نمبر درکار تھے۔ اتفاقاً پرچے کے جس صفحے پر اس نے آخری سوال حل کیا تھا۔اس کا مقابل صفحہ کراس نہیں تھا۔ میں نے اسے ایک سوال حل کرنے کو کہا اور پاس کر دیا۔اس کی آنکھوں میں تشکّر کے آنسو تھے۔ جب وہ رُخصت ہونے لگا تو اس نے میز پر ایک ہزار روپے کا نوٹ رکھا۔

غصے سے میری کنپٹیاں تڑخنے لگیں۔میں نے بمشکل اعصاب پر قابو پایااور کہا:

''بیٹا۔۔۔یہ اُٹھالو۔۔۔میرے رزق میں حرام کی آمیزش نہیں ہے۔''

لیکن وہ تیر کی مانند کمرے سے نکل چکا تھا۔ میرا جی چاہا اُسے فیل کردوں۔ میں پسینے میں تر بتر تھا۔ ہزار روپے کا نوٹ میز پر سے اُڑ کر پنکھے کے پروں سے چمٹ گیا، پورے گھر میں گھومنے لگا، صحن، برآمدہ، پھولوں کی کیاریاں، گملے، کچن اور گیلری۔۔۔نوٹ میں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں اور وہ گھوم رہا تھا۔ میرے من میں حلال حرام کی جنگ سوا نیزے پر تھی۔کوئی گہرے کنویں سے بولا۔

''پروفیسر! تم نے اس رقم کی Demand نہیں کی۔''

''لیکن ہے تو رشوت نا۔۔۔!''

''لیکن تم نے۔۔۔تم نے۔۔۔تم نے۔۔۔'' کنپٹیوں پر درد کی دستک بڑھتی چلی گئی۔

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔بالکل نہیں۔۔۔''

''پروفیسر گھر آئی دولت نہ ٹھکراؤ۔۔۔مقروض ہو تم۔۔۔قرض اُتارو۔''

جانے کتنے گھنٹے بیت گئے۔ جنگ کب سرد ہوئی مجھے یاد نہیں۔نوٹ میری واسکٹ کی جیب میں جا چکا تھا۔

''بیٹا۔۔۔!تم سن رہے ہونا!''

''جی انکل۔۔۔!''

''بس بیٹا!اس دن سے نوٹوں نے میری بیٹھک کا دروازہ دیکھ لیا۔چند برسوں میں اُدھار اُتر گیا لیکن بیماری اور پریشانیاں گھر کی دیواروں پر چڑھ آئیں،آنگن سے اُتر کر ہمارے وجود سے چمٹے اور یہیں کے ہو رہے۔''

''بیٹا۔۔۔!وہ سارے طالبِ علم مجھے سونے نہیں دیتے،آنکھوں میں انگارے بھر گئے ہیں۔میں ایک ایک Student کو جا کے یہ رقم لوٹانا چاہتا ہوں لیکن انہیں کہاں تلاش کروں؟ بیٹا تم ہی کوئی راستہ نکالو۔۔۔''

''انکل۔۔۔!بس ایک منٹ مجھے سوچنے دیجیے۔۔۔''

''بیٹا۔۔۔!فون بند نہیں کرنا۔''

''انکل۔۔۔! آپ ایسا کیجیے یہ رقم ان تمام Students کے نام پر صدقہ کر دیجیے اور اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگ لیجیے۔اس کی رحمت اس کے غضب سے پہلے ہے۔۔۔آپ کا گم شدہ سکون خود بخود لوٹ آئے گا۔''

''بیٹا۔۔۔!اللہ کریم تمہاری عمر دراز کرے۔میرے سینے سے بوجھ اُتر گیا ہے۔''

فون بند ہو گیا۔۔۔

میں نے آنکھیں موند کر اپنے والدِ محترم کے دوست کا دُکھ اپنے اندر اُترتا محسوس کیا۔

میرے سامنے پیپرز رکھے تھے اور پیپر ویٹ کے نیچے پانچ ہزار روپے کا نوٹ!
میں نے غور سے دیکھا میرا پورا گھر راکھ ہو چکا تھا۔

☆☆☆